معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے   فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ   ہوائی ڈاک   بیس پونڈ   یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک   سات پونڈ   یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۹   ماہ صفر ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۹۷ء   عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات

اس وقت پوری دنیائے اسلام صیہونیت کے جال میں پھنسی ہوئی ہے، یہود شروع ہی سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں پیش پیش ہیں اور اپنی عیاری سے وہ دوسری اقوام کو بھی مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کیے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس وقت تمام طاغوتی قوتیں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کر دینا چاہتی ہیں۔ عالم اسلام میں گزشتہ چند برسوں میں جو ہولناک واقعات پیش آئے ہیں ان میں یہودی ذہن ہی کی کارفرمائی رہی ہے، اسرائیلی ریاست کا قیام، کیمپ ڈیوڈ معاہدہ، فلسطین کی جزئی خود مختاری پر عرفات کی رضامندی اور اس کے نتیجہ میں فلسطینیوں میں اختلاف، ایران، عراق جنگ، صومالیہ اور روانڈا جنگیں، الجزائر میں جمہوریت کشی، عراق پر کویت کا حملہ، پھر عراق کی سرزنش، سعودی عرب میں امریکی فوجوں کا تسلط، لیبیا، ایران اور سوڈان پر بین الاقوامی پابندی۔ لبنان میں امریکی واسرائیلی جنگی تجربہ گاہ، بوسنیا ہرزیگووینا میں اسلامی حکومت کا انسداد، اخوان المسلمین کی دربدری، عمر عبدالرحمن کی قید، شاہ فیصل، جنرل ضیاء الحق اور ضیاء الرحمن کی شہادت، افغانستان کی خانہ جنگی، پاکستان میں مہاجر وغیر مہاجر اور شیعہ سنی اختلافات کے پس پردہ کون مشوق ہے..

ہندوستان میں ہندوتوا کے زور وشور، وشو ہندو پریشد کے جارحانہ عزائم اور دوسری فسطائی ہندو تنظیموں کی شر انگیزی کا سلسلہ بھی صیہونی سازش سے جڑا ہوا ہے، آئے دن ایک نہ ایک شاخسانہ کھڑا کر کے مسلمانوں کو اسی میں الجھا دینا ایک معمول ہو گیا ہے تاکہ وہ اپنی صلاح وفلاح سے غافل رہیں اور ان کی ساری قوت اپنے بچاؤ اور اپنے اوپر ہونے والے حملوں کے دفاع میں صرف ہوتی رہے اور وہ ملک کی تعمیر وترقی میں کوئی حصہ نہ لے سکیں، مسلم کش فسادات، ٹاڈا، تعلیم کے ذریعہ نسل کشی، پرسنل لا میں مداخلت، مسلم خواتین کی ہندوؤں سے اجتماعی شادی، بابری مسجد کا انہدام اور کاشی ومتھرا کے معابد پر یورش اور اب جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نیا مسئلہ جو یکم مئی کو دہلی ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ سے پیدا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں اسکی اصل خصوصیت

اور اقلیتی کردار باقی نہیں رہے گا۔ ۱۹۸۸ء میں جامعہ کو سنٹرل یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا تو اسکے ارباب حل وعقد یونیورسٹی پانے کی خوشی میں یہ نہ سمجھے کہ یہی اس کے اقلیتی کردار کو سلب کرنے کا پیش خیمہ بنے گا

خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زیر اثر گاندھی جی کی اس اپیل پر جامعہ کا قیام عمل میں آیا تھا کہ "برطانوی تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے گا" چنانچہ مولانا محمد علی کی قیادت میں ایم۔اے۔او کالج کے طلبہ نے وہاں تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا، اس کے بعد کالج کی مسجد میں جمعہ کے دن ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ کے قیام کا اعلان ہوا، جس کی تاسیس کی رسم شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے متبرک ہاتھوں سے ادا ہوئی، وہ اپنی ناتوانی کی وجہ سے اپنا خطبہ تاسیس خود نہ پڑھ سکے تو ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے یہ خطبہ پڑھا، جس میں حضرت نے فرمایا تھا "مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد وخیالات اور کیا باعتبار اخلاق واعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں، بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے"۔ اور بقول ڈاکٹر ذاکر حسین اس وجود مقدس کی ہڈیاں قید، جلاوطنی اور تفکرات ملی نے گھلا دی تھیں اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب فرما رہے تھے جو انکے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔

ان برگزیدہ حضرات کی دعاؤں اور تدبیروں کے نتیجہ میں اتنے بلند مقاصد اور پاکیزہ عزائم کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ عمارت چند پھوس کے بنگلوں پر مشتمل تھی اور پڑھائی درختوں کے نیچے ٹاٹ کے فرش پر ہوتی تھی اور جب یہ بھی نہ ہوتا تو اپنے اپنے چغے چٹائیوں کی طرح بچھا لیتے تھے، کون سوچ سکتا تھا کہ قوم وملت کے نام پر قائم

ہونے والا یہ مقدس ادارہ جب یونیورسٹی کا روپ اختیار کرے گا تو اس کی امتیازی خصوصیات باقی نہ رہیں گی اور اس کا اقلیتی کردار سلب کر لیا جائے گا اور مسلمانوں کے خون پسینہ، محنت مشقت اور مزدوری کے پیسوں سے بننے والی یونیورسٹی میں انہی کو نہ کوئی مراعات حاصل ہوگی اور نہ داخلے کی سہولتیں میسر آئیں گی۔ اس وقت جس عدالتی فیصلے نے مسلمانان ہند کو عموماً اور جامعہ کے طلبہ، اساتذہ اور ملازمین کو خصوصاً اس قدر ہیجان و اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے، ہماری قومی حکومت کا فرض ہے کہ اسے دور کرے۔ اس کے لیے ۱۹۸۸ء کے ایکٹ میں بنیادی ضروری ترمیم لازمی ہے، طلبہ پر کسی طرح کا ظلم و تشدد نہ کیا جائے، خوش قسمتی سے اس وقت ملک کی سربراہی اردو کے ایک دانشور کر رہے ہیں اگر ان کے دور میں جامعہ کا اردو کلچر ختم ہوا تو یہ ایک بڑا المیہ ہوگا۔

اترپردیش اسمبلی کے ممبران عالم بدیع اور وسیم احمد کو جو اعظم گڈھ کے بعض حلقوں کی نمائندگی کر رہے ہیں اور جن کو علامہ شبلی کے ہم خاندان و ہم وطن ہونے کا فخر حاصل ہے ابھی تک اس لیے حلف نہیں دلایا جاسکا کہ وہ اپنی مادری زبان اردو میں حلف لینا چاہتے ہیں جو ان کا آئینی، دستوری اور جمہوری حق ہے کیونکہ دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی ملک کی ایک تسلیم شدہ زبان ہے اور وہ اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان بھی ہے، ریاستی حکومت اور اسمبلی کے اسپیکر انہیں اردو میں حلف نہ دلا کر تعصب و تنگ نظری کا ثبوت ہی نہیں دے رہے ہیں بلکہ اردو دشمنی کا رویہ اختیار کر کے آئین، انصاف، دستور اور جمہوریت کو پامال کر رہے ہیں، غالباً ڈاکٹر فریدی مرحوم کے علاوہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے کسی اردو نواز ممبر نے ابھی تک اتنا مبارک اور جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھایا تھا، ہم ان دونوں ممبروں کو اردو دوستی پر انہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ اس ظلمت و تیرگی میں انہوں نے امید کا دیا تو روشن کیا ہے۔

پیدا کہیں جنوں کے ساماں ہوئے تو ہیں۔

مقالات

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے امتیازی پہلو

از پروفیسر ریاض الرحمن شروانی علی گڑھ

اردو کے مشہور صاحب طرز ادیب اور باذوق نقاد جناب مہدی حسن افادی الاقتصادی نے اپنے مضمون اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ میں لکھا ہے: "سرسید سے معقولات اگر الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے، حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر (محمد حسین) آزاد صرف انشاپرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔[1]" جب ہم مہدی افادی صاحب کی اس رائے پر علامہ شبلی نعمانی کے تعلق سے سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو ان کی انشاپردازی کی داد تو دے سکتے ہیں لیکن اس قول کی صداقت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی (ج ۱ و ۲) کے علاوہ الفاروق، المامون، الغزالی، سیرت النعمان، سوانح مولانا روم اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر جیسی اہم تاریخی کتابیں لکھیں یا دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے تاریخی واقعات کے چوکھٹے میں اپنے لائق فخر و مباہات ہیروں کی قلمی تصاویر اس طرح سجائیں کہ ان کے جمیل و لطیف نقوش نے ایک طرف ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں ایمان و ایقان کی شمعیں فروزاں کیں اور دوسری طرف ان کی آنکھوں کی روشنی بڑھائی۔ گویا علامہ نے اپنی

تصانیف کے ذریعے تاریخ و سوانح نگاری کا ایسا حسین و دقیع امتزاج پیش کیا جو اس سے پہلے اردو کے کسی دوسرے مصنف نے نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ علامہ شبلی کے قلمی فتوحات کا دائرہ تاریخ و سوانح تک محدود ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم خصوصاً طرز تعلیم کا بھی نہایت تعمق فکر اور دیانت داری سے جائزہ لیا اور روم و مصر و شام کا سفر نامہ بھی لکھا اور اس وقت لکھا جب ہمارے یہاں بیرونی ممالک کے سفر اور سفر ناموں کی روایت اتنی عام نہیں ہوئی تھی جتنی بعد میں ہوئی۔ یہ سفر علامہ نے ۱۸۹۲ء میں کیا تھا اور سفر نامے کی تکمیل ۱۸۹۴ء میں ہوئی۔ خود علامہ شبلی کے اعتراف کے بموجب یہ سفر نامہ مروج سفر ناموں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں بعض ایسی تفصیلات نہیں ہیں جو سفر ناموں کا لازمی جز سمجھی جاتی ہیں، یعنی "ملک کی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے" دراصل یہ سفر نامہ بڑی حد تک ان ملکوں کے علمی اور معاشرتی حالات تک محدود ہے۔ اس کا سبب حیاتِ شبلی کے فاضل مصنف مولانا سید سلیمان ندوی نے اس زمانے کی بین الاقوامی سیاست میں انگریزوں اور ترکوں کے اختلافات اور مسلمانان ہند کی ترکوں کے ساتھ ہمدردی کو قرار دیا ہے جو یقیناً درست ہے، لیکن میری ناچیز رائے میں اس کا ایک سبب خود علامہ شبلی کا ذوق بھی ہے جو ان کے دوسرے اذواق پر حاوی تھا۔ انھوں نے اپنے اس سفر نامے میں مولانا ابو الکلام آزاد کے الفاظ میں سیاست کو احتیاط کی چھلنی میں کتنا ہی چھانا ہو پھر بھی سید صاحب کا ارشاد ہے کہ ایک طرف "انگریزوں نے مولانا کے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا" اور دوسری طرف "یہی وہ کتاب ہے جس سے کالج (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ) اور مولانا کی تصنیفات میں ہند!

فراخ بینی و بینک کا اصول جاری ہوا" علامہ کے متفرق مقالات و رسائل کا علمی محور جتنا وسیع ہے ان میں تحقیق و تفحص کا جو اعلیٰ اصول پیش نظر رکھا گیا ہے، معلومات کی جو فراوانی ہے اور اسلوب نگارش علمی ہونے کے ساتھ ساتھ جتنا شگفتہ اور دل نشین ہے اس کا اعتراف ہر صاحبِ نظر اور دیانت دار قاری اور نقاد کو ہے۔ ان میں سے کم دو رسالے ایسے ہیں جن کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنا ضرور محسوس ہوتا ہے، ایک کتب خانہ اسکندریہ اور ایک الجزیہ۔ یوروپین مصنفین نے اپنے خیال کے مطابق مسلمان فاتحین کی وحشت و بربریت ثابت کرنے کے لیے ان پر جو الزامات عائد کیے تھے ان میں ایک الزام جو بہت زور شور سے لگایا جاتا تھا، یہ تھا کہ جب حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مصر اور اسکندریہ فتح ہوئے تو عرب فاتحین نے وہاں کے قدیم اور مشہور یونانی کتب خانے کو جلا کر بھسم کر دیا۔ علامہ نے اس کی تردید میں جو مضمون لکھا اس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ علیحدہ کر دیا یعنی یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کتب خانہ مسلمانوں کی فتح مصر و اسکندریہ سے سینکڑوں برس پہلے برباد ہو چکا تھا۔

جزیہ ان امور میں سے ہے جن سے ماضی کے مسلمان خلفاء و سلاطین بلکہ (نعوذ باللہ) خود اسلام کو بدنام کرنے کا سب سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی بعض دوسرے امور جہاد، غلامی کی حلت، تعدد ازدواج وغیرہ ہیں۔ جزیے کا علامہ نے اپنے اس رسالے میں بہت غور و فکر اور شرح و بسط سے جائزہ لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے غیر مسلموں پر ظلم قرار دیا جا سکے۔ منجملہ دیگر تشریحات کے، جو دوسرے مسلمان اہل علم و قلم بھی کرتے رہے ہیں، علامہ شبلی نے ایک ایسی بات لکھی ہے جو میرے نزدیک جزیے پر معاندین کے اعتراضات کو بالکل باطل کر دیتی ہے۔ یہ تو

سب جانتے ہیں کہتے ہیں کہ جزیہ ایک ایسا ٹیکس ہے جو اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں سے فوجی خدمت کے عوض لیا جاتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اسلامی ریاست کے جو غیر مسلم شہری فوجی خدمت کے لیے آمادہ ہوں، ان کے ساتھ اس معاملے میں کیا رویہ ہوگا۔ بیشتر علماء کی رائے ہے کہ چونکہ جہاد اسلامی کا فریضہ ہے اس لیے اس میں غیر مسلموں کو شریک نہیں کیا جاسکتا، لیکن علامہ شبلی نے بالتصریح لکھا ہے کہ اگر کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شریک ہونا یا شرکت کے لیے آمادہ ہونا گوارا کیا تو وہ جزیے سے بری کر دیے گئے[8] اور پھر یہی موقف ترجمان القرآن میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اختیار کیا ہے۔

تنقید کے میدان میں شعر العجم علامہ شبلی کا شاہکار ہے۔ ہندوستان میں فارسی ادب و شعر کا ذوق آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا، اس کو مہمیز کرنے میں اس کتاب کا بڑا حصہ ہے علامہ شبلی کی فارسی شعر و ادب پر نگاہ وسیع بھی تھی اور عمیق بھی۔ ان کا ادبی ذوق نہایت لطیف تھا اور اس پر مستزاد ان کا دل نشین اسلوب نگارش۔ ان سب باتوں نے مل کر بلاشبہ اسے قدر اول کی تصنیف بنا دیا۔ یہ صحیح ہے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس پر ڈاکٹر[9] محمود شیرانی اور بعد میں بعض دوسرے اہل علم نے اعتراضات کیے ہیں اور بعض کمیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اول تو تحقیق ایسا موضوع ہے جس میں اختلاف اور اضافے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے، دوسرے یہ فیصلہ تفصیلی محاکمے کا محتاج ہے کہ اس معاملے میں کس کی رائے کس حد تک درست ہے۔ شعر العجم کے علاوہ موازنۂ انیس و دبیر اس میدان میں علامہ کا ایک دوسرا وقیع کارنامہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میر انیس کو اردو شاعری میں ان کا جائز مقام دلانے میں موازنہ نے بڑا کام کیا ہے۔

علامہ شبلی شاعر بھی تھے۔ اردو اور فارسی میں ان کی قومی و ملی نظمیں اور فارسی میں انکی غزلیں انہیں شعراء کی صف میں بھی ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ شاعری کو انہوں نے اپنا روزمرہ کا مشغلہ نہیں بنایا تھا اور اس لیے وہ اس میں غالب یا اقبال نہیں بن سکے تاہم مولانا ابوالکلام کی رائے ہے کہ "ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، ان پر ختم ہوئی"[10]

میں نے ابھی تک علامہ کی دو نہایت اہم اور قابل ذکر لیکن اسی قدر متنازعہ فیہ تصانیف یعنی علم الکلام اور کلام کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ میری نظر سے اپنی تعلیم کے ابتدائی دور میں الفاروق گزر چکی تھی لیکن اس مطالعے کو میں سرسری مطالعہ ہی قرار دے سکتا ہوں۔ الفاروق اور علامہ کی بعض دیگر تصانیف کا توجہ سے مطالعہ کرنے کا موقع مجھے بعد میں ملا اور اس ذوق کی افزائش میں علم الکلام اور الکلام ہی نے حصہ لیا۔ بی۔ اے میں میرا ایک اختیاری مضمون فلسفہ بھی تھا اور ہمارے فلسفے کے نصاب میں ایک پرچہ مسلم فلسفے کا شامل تھا۔ جب میں نے فلسفہ خاص طور سے مسلم فلسفہ پڑھا تو طبیعت علامہ شبلی کی تصانیف علم الکلام اور الکلام کے مطالعے کی طرف راغب ہوئی۔ اس طرح علامہ کی یہ پہلی دو تصانیف ہیں جن کا میں نے کسی قدر غائر نظر سے مطالعہ کیا اور انہی کے مطالعے سے میرے اندر علامہ کی دیگر تصانیف کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی شہادت کے مطابق علامہ شبلی علم الکلام کو اپنی ناقص تصنیف تسلیم کرتے تھے[11] سید صاحب نے حیات شبلی میں علامہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے، بلکہ اس بارے میں ان کا عکس تحریر بھی حیات شبلی میں شامل کر دیا ہے کہ "میں عقائد اسلام اور مسائل فقہ دونوں میں حنفی ہوں"[12] لیکن میں اعتراف کرنا

چاہتا ہوں کہ ان دونوں کتابوں کے مطالعے کے بعد میری نظر میں کچھ مدت کے لیے معترضین کی وقعت پیدا ہوگئی تھی۔

چونکہ اس مقالے کا موضوع علامہ شبلی نعمانی کے تصنیفی کارنامے نہیں ہے، اس لیے ان کی گرانقدر تصانیف بالخصوص ان تصانیف کی طرف چند سرسری اشارے ہی کرنے پر اکتفا کی گئی ہے جو مہدی افادی صاحب مرحوم کے کھینچے ہوئے حصار سے باہر ہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ بعض دیگر امور جو آیندہ صفحات میں زیربحث آئیں گے ان کی کیفیت بھی ہمارے نزدیک اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جو علامہ کی تصنیفی حیثیت کے بارے میں ان کے ایک مخلص دوست اور مداح خصوصی نے غالباً محض جوشِ انشاپردازی میں ظاہر کی تھی۔

علامہ شبلی کی ولادت جیسا کہ معلوم ہے مئی[ع] ۱۸۵۷ء کے اس دور میں ہوئی تھی جب ہندوستان کی قسمت کا آخری فیصلہ ہو رہا تھا۔ اس فیصلے کے نتائج بہت ہمہ گیر، دوررس اور دیرپا ثابت ہوئے۔ ان نتائج سے نبردآزما ہونے کے لیے ہندوستان کے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص جن باہمت، ذی شعور اور دور اندیش اکابر نے جو طریقے سوچے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ان میں سے بعض سے اپنے اپنے ذوق اور رجحان طبع کے مطابق اتفاق یا اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن میری ناچیز رائے میں کسی کی نیک نیتی پر شبہ مناسب نہیں ہوگا۔ ان اکابر میں علامہ شبلی کا نام نامی بھی شامل ہے اور قدرتی طور پر جب انہوں نے اپنی سوچی سمجھی رائے اور لائحہ عمل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی تو ان کا بعض دوسرے اکابر ملت سے ایک حد تک اختلاف ناگزیر تھا۔

ع اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ علامہ کی پیدائش ۴ جون کو ہوئی تھی۔ (ض)

علامہ شبلی کے تین بھائی تھے اور وہ ان سب میں بڑے تھے۔ یہ بہت عجیب اور بامعنی اتفاق ہے کہ ان کے والد ماجد شیخ حبیب اللہ نے اپنے اور سب بیٹوں کو تو انگریزی تعلیم دلائی لیکن بڑے بیٹے محمد شبلی کے لیے وقت کے رواج کے مطابق دینی تعلیم کا بندوبست کیا۔ اس کا ظاہری سبب جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے، یہ تھا کہ سرسید کے تعلیمات کے زیر اثر شیخ صاحب کو اولاد کی انگریزی تعلیم کی طرف توجہ بعد میں ہوئی[لہ] لیکن ہمارے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر علامہ شبلی نے بھی وہی تعلیم حاصل کی ہوتی تو بعد میں وہ نہ بن سکتے جو بنے بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی مانند یا ایک کامیاب وکیل ثابت ہوتے یا سرکار انگلشیہ میں اس وقت کے پیمانوں کے مطابق کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جاتے۔ یہ تو ممکن تھا کہ سرسید کی طرح کسی وقت قومی اور ملی خدمت کا جذبہ انہیں غیر ملکی حکومت کی ملازمت سے دست کش ہو کر اس خدمت کے لیے وقف کر دیتا، پھر بھی عالم دین ہوتے ہوئے یا عالم دین ہونے کے سبب انہیں قدیم و جدید کی جس کش مکش سے گزرنا پڑا اور اس کش مکش نے ان کی شخصیت کے جو جوہر چمکائے اور ان کی ذات میں جو دلآویزی پیدا کی اس سے دنیا محروم رہ جاتی۔ یہاں ان کے تعلیمی کوائف کا ذکر ہمارے خیال سے غیر ضروری ہے کیونکہ یہ کوائف اس زمانے کے بیشتر اہلِ علم میں مشترک ہیں۔ ان کے اساتذہ میں یقیناً بعض بہت لائق فائق اور اپنے اپنے فن میں ماہر علما، شامل تھے، مثلاً حدیث میں مولانا احمد علی سہارنپوری اور ادب میں مولانا فیض الحسن۔ لیکن وہ پارس جس سے مَس ہو کر کے محمد شبلی خالص سونا بنے بلاشبہ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک استاد، شیخ یا مصلح کی صحبت وہ کام کر جاتی ہے جو دوسروں کا عمر بھر کا ساتھ نہیں کر سکتا ہے۔ ہاں البتہ

بعد کا مطالعہ و مشاہدہ سونے پر سہاگے کا کام ضرور کرتا ہے۔ مکاتیب ڈاکٹر سر محمد اقبال مرتبہ شیخ عطاء اللہ مرحوم کے پیش لفظ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے کتنا صحیح لکھا ہے: "اقبال کو خوش بختی سے اپنے وطن سیالکوٹ کے کالج میں بقول سر شیخ عبد القادر علمائے سلف کی یادگار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ایک بزرگ مولوی سید میر حسن صاحب کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی۔۔۔ اقبال نے فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی۔ اصل بنیاد اقبال کے اردو اور فارسی ادب میں بلند پایہ، ممتاز عصر، بامعرفت ادیب ہونے کی یہ ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی صحبت و تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام دیا مگر سونا پرانی کان کا تھا۔ آج کے تعلیم یافتہ سہاگہ ڈالتے ہیں مگر سونا کہاں۔ جلا آجاتی ہے، جوہر نہیں پیدا ہوتے"۔[12] علامہ شبلی کو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مانند "یورپ کی صحبت و تعلیم" تو میسر نہیں آئی لیکن علی گڑھ میں سر سید، پروفیسر آرنلڈ اور بعض دوسرے اہل علم اور علم دوست اکابر کی صحبت و رفاقت نے اس کمی کو ایک حد تک پورا کیا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "مولانا کو کالج (ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ) آکر سب سے بڑا فائدہ یہ پہونچا کہ یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا"[13] لیکن بات وہی ہے کہ سونا پہلے سے موجود تھا، سہاگہ پڑا تو جوہر چمک اٹھے۔ مولانا شروانی نے اس پر یہ اضافہ بھی فرمایا ہے: "علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اس پر اطمینان سے غور کیا، جو اصول عمدہ تھے ان کو اخذ کیا۔۔۔ نمایشی چیزوں کو رد کر دیا"۔[14] بات آگے بڑھ گئی، ذکر علامہ شبلی کی تعلیمی زندگی کا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

علامہ شبلی نے والد ماجد کے حسب منشا وکالت کی تعلیم بھی حاصل کی اور کچھ مدت وکالت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن طبیعت کا رجحان اُدھر نہیں تھا، جلدی چھوڑ بیٹھے۔ مختلف محکموں میں بعض چھوٹی موٹی ملازمتیں بھی کیں لیکن ان ملازمتوں کے آداب نبھانا دشوار تھا۔ لہٰذا ان سے بھی دست بردار ہو گئے۔ کچھ عرصہ پرانے زمینداروں کے طریقے کے مطابق والد محترم کے نیل سازی کے کام کی نگرانی بھی کی لیکن یہ بھی ان کے بس کا کام نہ تھا۔ زیادہ دیر تک اس سے بھی منسلک نہیں رہ سکے۔[15] اس پس منظر کے ساتھ علامہ شبلی ۱۸۸۱ء میں جب کہ ان کی عمر ۲۴ سال تھی، علی گڑھ پہونچے اور سر سید کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی شان میں ایک قصیدہ پیش کیا۔[16] یہ ملاقات پیش خیمہ ثابت ہوئی، ان کے علی گڑھ اور سر سید سے مستقل تعلق کا اور ان کی کتاب زندگی کے ایک نئے باب کے آغاز کا۔ ۱۸۸۳ء میں وہ ایم۔ اے۔ او کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔[17]

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ اس وقت سر سید کی عمر ۶۶ سال تھی اور علامہ شبلی کی ۲۶ سال۔ سر سید علامہ شبلی سے عمر میں ۴۰ سال بڑے تھے۔ پھر وہ کالج کے سکریٹری اور حاکم اعلیٰ تھے اور علامہ شبلی کا تقرر اس کے ایک شعبے میں معلم کی حیثیت سے ہوا تھا۔ گویا دونوں کی معاصرت محض برائے نام تھی، اصلی رشتہ بزرگی اور خوردی یا افسری اور ماتحتی کا تھا۔ سر سید نے علامہ شبلی کی ذہانت اور شوق مطالعہ کا اندازہ اول روز ہی کر لیا تھا اور ان کی ہمت افزائی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ علامہ شبلی کے لیے وقف کر دیا اور علامہ شبلی نے اس سے جی بھر کر استفادہ کیا۔[18] آہستہ آہستہ ان کے تعلقات کالج سے براہ راست اور بالواسطہ متعلق دیگر اہل علم سے استوار ہوئے مختلف علمی موضوعات پر ان سے تبادلۂ خیال ہونے لگا اور علمی لین دین

کا سلسلہ شروع ہوگیا یعنی علامہ شبلی نے طالب علموں اور احباب کو کچھ دینے کے ساتھ ان سے سیکھنے اور اخذ کرنے میں بھی تامل نہیں کیا۔ یہی قدیم علمائے اسلام کی روایت تھی بالخصوص اسلام عربوں کے ذریعہ جن ممالک میں پہنچا عربوں نے جہاں انہیں ایمان کی دولت عطا کی اور عربی زبان کا تحفہ پیش کیا وہاں جو کچھ لینے کے قابل تھا ان سے وہ لینے میں بھی پس و پیش نہیں کی۔ یونان سے فلسفہ اور طب، ایران سے فن تعمیر اور دیگر تہذیبی امور اور ہندوستان سے ریاضی اور اقلیدس میں بہت کچھ حاصل کیا تاہم یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ان ممالک سے جو کچھ لیا تھا اس میں اپنی طرف سے مزید اضافہ کر کے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ جو علوم زیر زمیں دفن ہو چکے تھے یا جن کا حلقہ اثر کسی ایک ملک کی چہار دیواری میں محدود تھا، مسلمانوں کی بدولت ان کی روشنی ساری دنیا میں پھیلی اور عہد تاریکی کا خاتمہ ہوا۔ اب یہ امر آخر ہے اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ دوسروں بالخصوص مغربی ممالک نے ان علوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور ہم کہاں رہ گئے۔ بہر حال علامہ شبلی نعمانی اس روایت کے وارث تھے اور انہوں نے اس وراثت کا حق ادا کیا۔ انہوں نے ایک طرف علی گڑھ کے طالب علموں میں عربی زبان وادب سے شغف پیدا کرنے کی ہر امکانی کوشش کی اور دوسری طرف ان میں مذہبی جذبات کے فروغ سے پوری دلچسپی لی۔ کالج میں اور کالج سے باہر بھی علامہ کی شہرت اور مقبولیت کا ایک بڑا ذریعہ ان کی شاعری ثابت ہوئی۔ علی گڑھ سے علامہ نے جو استفادہ کیا اس کا اعتراف ان کے شاگرد رشید اور فاضل سوانح نگار مولانا سید سلیمان ندوی نے بہت فراخدلی سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہاں رہ کر ان کی شاعری کا رنگ بھی بدلا، انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس بھی ہوا، بعض ایسی غیر ملکی بالخصوص مغربی

تصانیف سے واقفیت بھی ہوئی جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی اور تاریخی ذوق بھی نمایاں ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یوروپ کی تحقیقات علمیہ سے آگاہی ہوئی جس کا سب سے بڑا ذریعہ پروفیسر آرنلڈ بنے[۱۹]۔ پروفیسر آرنلڈ اور علامہ شبلی کے تعلق کا کچھ ذکر اوپر گزرا ہے۔ دونوں میں دو طرفہ استادی شاگردی کا رشتہ بھی قائم ہوا یعنی علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ سیکھی اور پروفیسر آرنلڈ نے ان سے عربی کی تحصیل کی[۲۰]۔ یہاں موضوع سے کسی قدر انحراف کر کے جو در اصل انحراف ہے بھی نہیں، یہ عرض کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ علامہ شبلی اور پروفیسر آرنلڈ کے باہمی مراسم پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے، اس پر شیخ محمد اکرام نے یادگار شبلی میں یہ اعتراض کیا ہے کہ "... آرنلڈ کالج میں ۱۸۸۸ء میں آیا ... اس وقت تک شبلی کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ اس میں جتنا دخل سرسید کو تھا کسی اور کو نہ تھا"[۲۱]۔ توجہ طلب یہ امر ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کے علامہ شبلی پر اثرات کے اعتراف کا یہ مطلب کیسے ہوا کہ کسی اور (بالخصوص سرسید) کا اثر انہوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ جہاں علامہ شبلی نے علی گڑھ کے صالح اثرات قبول کیے، وہاں اس کے کمزور پہلو بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہے۔ انگریزی تعلیم کی سطحیت انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں (بالخصوص اس وقت کے نوجوانوں) کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور پورے ماحول کا کھوکھلا پن ان پر شروع ہی سے آشکار تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے بعض اعزہ کے نام خطوط میں اول روز سے کیا۔ تاہم وہ برابر اس امر میں کوشاں رہے کہ وہاں طلبہ میں صحیح علمی ذوق پیدا ہو، بالخصوص عربی اور فارسی زبان وادب سے انہیں مناسبت ہو جائے اور اپنی اس کوشش میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی

ہوئے۔ ساتھ ہی درس قرآن مجید کے ذریعہ اور اپنی تقریروں اور گفتگو کے وسیلے سے طلبہ میں مذہبی رجحانات پیدا کرنے کا عمل برابر جاری رکھا اور اس میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ تاہم یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے صرف نظر ممکن نہیں کہ ایم۔ اے۔ او کالج یا اس کی جانشین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مقاصد دارالعلوم دیوبند یا ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مقاصد سے بنیادی طور پر مختلف تھے، اس لیے ان میں ہم آہنگی ایک حد تک ہی پیدا کی جاسکتی تھی اور اب بھی یہی صورت حال ہے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ علامہ شبلی یا کوئی دوسرے بزرگ علی گڑھ میں نہ عربی علوم کی جڑیں اتنی گہری پیوست کرسکتے تھے جتنی عربی مدارس میں ہیں اور نہ وہ مذہبی ماحول پیدا کرسکتے تھے جو ان اداروں کا ہے۔ یہی بات دوسری طرح بھی عرض کی جاسکتی ہے یعنی دیوبند یا ندوۃ العلماء میں انگریزی اور عصری تعلیم کا اس حد تک نفاذ ممکن نہیں ہے جس حد تک مغربی طرز کی علمی درسگاہوں میں ہے۔

سرسید نے مسلمانوں کے امراض کے لیے جو نسخہ تجویز کیا تھا اس کا سب سے بڑا جز انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی علوم کا حصول تھا۔ ایم۔ اے۔ او کالج میں عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا گیا لیکن وہاں ان کی حیثیت ثانوی ہی رہی، بنیادی اہمیت انگریزی زبان وادب، سائنس یا زیادہ سے زیادہ سماجی علوم کی تھی۔ بلکہ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ حصول آزادی کے بعد وہ علوم جنھیں ہم مشرقی علوم کہتے ہیں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا ہے۔

یہاں سلسلۂ کلام میں تھوڑا سا خلل ڈال کر کچھ علی گڑھ تحریک کے بارے میں

عرض کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ۱۸۵۷ء کے المیے کے بعد مسلمانان ہند میں بیداری اور بدلتے ہوئے حالات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے مختلف گوشوں سے جو کوششیں کی گئیں ان میں ایک نہایت اہم اور بارآور کوشش وہ تھی جو علی گڑھ کی سرزمین سے سرسید احمد خاں نے کی۔ سرسید کی اپنی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی۔ وہ ۱۸۵۷ء کے المیے سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس المیے کے بعد انگریزی سرکار میں مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے لیکن ایک وقت آیا کہ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانان ہند کی خدمت ذاتی منفعت کے کاموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ ملازمت سے دست بردار ہوکر اُدھر متوجہ ہوگئے۔ دراصل انھوں نے یہ کام اپنے دوران ملازمت ہی سے شروع کردیا تھا۔ انھوں نے اس سمت میں جو مختلف اقدامات کیے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی، مدرستہ العلوم قائم کیا، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس کی، اسباب بغاوت ہند لکھی، تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا، یہاں تک کہ قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ سب سرسید کے جداگانہ نوعیت کے اقدامات تھے، یا ان میں کوئی رشتۂ اشتراک تھا۔ میری ناچیز رائے میں دراصل یہ ان کے ایک وسیع منصوبے کے اجزائے ترکیبی تھے اور وہ منصوبہ تھا مسلمانوں میں بیداری، روشن خیالی اور وسیع النظری پیدا کرکے انھیں باعمل بنانا اور مغرب سے درآمد شدہ نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ان میں صلاحیت ابھارنا۔ ان کا سارا زور سائنٹفک نقطہ نظر اور عقل کی بالادستی پر تھا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں میں یہ اوصاف انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی علوم بالخصوص سائنس کی تحصیل ہی سے پیدا ہوسکتے تھے۔ سرسید سمجھتے تھے کہ

انہیں اپنے اس مقصد میں اس وقت تک کامیابی نہیں ہوسکتی جب تک حکومت وقت
کا پورا تعاون حاصل نہ ہو، اسی لیے وہ انگریزوں سے موالات کے حامی تھے۔ انگریزی یا
مغربی علوم کی تحصیل کے ساتھ مغربی تمدن کا سماج میں نفوذ اس وقت کے حالات میں
ناگزیر تھا اور سرسید اور ان کے رفقا نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں حوصلہ افزائی کی۔

علامہ شبلی جس ذہنی اور علمی پس منظر کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے اس کی موجودگی
میں وہ ان اقدامات کا ایک حد تک ہی ساتھ دے سکتے تھے اور سرسید کے دوش
بدوش کچھ فاصلے ہی تک چل سکتے تھے۔ شیخ محمد اکرام نے یادگار شبلی میں لکھا ہے "حقیقت
یہ ہے کہ شبلی کی ذہنی اور علمی ساخت میں (ان کی غیر معمولی طبعی صلاحیتوں کو چھوڑ کر) سب
بڑا حصہ دو شخصوں کا تھا، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور سرسید کا۔ شبلی مولانا چریا کوٹی
کے زیر اثر اس زمانے میں رہے جب ذہن انسانی ایک لوح سادہ کی طرح اثر پذیر
ہوتا ہے۔ اس لیے مولانا محمد فاروق کا اثر سب سے دیرپا ثابت ہوا۔ پھر ایک زمانے
میں شبلی سرسید کے رنگ میں رنگے گئے۔ یہ رنگ ایک زمانے میں دھلنا شروع ہوگیا۔"[۲۲]
شیخ صاحب نے تو یہ باتیں بطور تعریف لکھی ہیں لیکن یہ درست ہے کہ علامہ شبلی کی ابتدائی
تعلیم و تربیت نے ان پر جو رنگ چڑھایا تھا کوئی دوسرا رنگ اس پر پوری طرح غالب نہیں
آسکا۔ میرے خیال سے اثر اندازی اور اثر پذیری کا معاملہ بہت عجیب اور پیچیدہ ہے۔
کسی شخص پر کسی دوسرے شخص کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مبالغے سے کام لیا
جاتا ہے۔ ہر سوچنے والے ذہن اور محسوس کرنے والے دل کا حامل انسان اپنی زندگی
کے مختلف مراحل پر مختلف شخصیتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یہ اثر
اس کی پوری زندگی پر حاوی ہو۔ اثر جزوی بھی ہوسکتا ہے اور وقتی بھی اور یہ نہ کوئی

حیرت انگیز بات ہے اور نہ لائق تعزیر اور پھر بعض اوقات طبائع کی یکسانیت کو اثر اندازی
اور اثر پذیری کا نام دے دیا جاتا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علامہ شبلی کے سرسید اور علی گڑھ تحریک سے اختلافات
کے ظاہری اسباب جو بھی رہے ہوں میرے نزدیک اس کا بیج ان کی طبیعت میں ابتدا
ہی سے موجود تھا۔ وہ ۲۴ سال کی مختصر عمر میں علی گڑھ آئے تھے لیکن اس وقت بھی انکی
شخصیت ایک خاص سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ابھی یہ سانچہ پختہ نہیں
ہوا تھا۔ انہوں نے سرسید اور علی گڑھ کے بعض دوسرے اشخاص اور وہاں کے جدید
علمی ماحول سے استفادہ کیا اور علی گڑھ کو بھی اپنی ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچایا۔
ان کی نظر میں علی گڑھ تحریک کی بعض خامیاں شروع سے تھیں اور وہ حتی الامکان ان
خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں علامہ شبلی کے سرسید سے اختلافات کا تفصیلی
جائزہ لیا ہے۔ ہمارے سامنے سرسید سے ان کا پہلا اختلاف الفاروق کی تصنیف کے
سلسلے میں آتا ہے۔ علامہ شبلی نے مسلمانوں میں نئی روح اور تازہ زندگی پیدا کرنے کے
لیے ناموران اسلام کے سوانح لکھنے کا ایک ہمہ گیر منصوبہ بنایا تھا۔ ان کی نظر میں اسلاف
کرام میں سب سے جامع شخصیت حضرت عمر فاروقؓ کی تھی۔ اس لیے وہ قدرتی طور پر
ان کے سوانح لکھنے کی طرف مائل تھے۔ سرسید کو اندیشہ تھا کہ یہ تصنیف شیعہ سنی اختلافات
کو بڑھاوا دینے کا سبب ہوسکتی ہے جو کالج کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ اس بارے میں
نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو حکم بنایا گیا۔ نواب صاحب ایک ممتاز شیعی رہنما
اور ایم۔ اے۔ او کالج کے ہمدرد اور معاون تھے۔ ان کا فیصلہ علامہ شبلی کے حق میں تھا۔

پھر بھی سرسید کا اندیشہ دور نہیں ہوا۔ اس اختلاف رائے نے علامہ شبلی کے ارادے میں بھی تزلزل پیدا کیا۔[۲۳] لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ بالآخر یہ کتاب علامہ شبلی کے ذہن سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوکر زیور طبع سے آراستہ ہوئی کیونکہ اس سے ایک طرف ہمارے سوانحی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ ہوا اور دوسری طرف اردوداں طبقے کی نظر میں حضرت فاروق اعظمؓ کا صحیح مقام متعین ہوا۔

سرسید سے علامہ شبلی کے اختلافات مذہبی آراء میں بھی تھے اور سیاسی امور میں بھی۔ ایک حد تک علامہ شبلی نے اپنے موقف میں لچک بھی پیدا کی لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے وہ ان مسائل میں سرسید کا ساتھ ایک حد تک ہی دے سکتے تھے اس سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک مذہبی افکار کا تعلق ہے سرسید کا نقطۂ نظر کئی معاملات میں جمہور علماء سے مختلف تھا۔ وہ مسلمانوں کی نہ صرف دنیوی بلکہ دینی اصلاح بھی مغربی فکر سے ہم آہنگی میں مضمر سمجھتے تھے۔ اس رائے کا اظہار انہوں نے اپنے رسالے تحریر فی اصول التفسیر میں کیا ہے۔[۲۴] یہی ان کے اور جمہور علماء کے مذہبی مسلک کا نقطۂ انفصال ہے اور اس میں علامہ شبلی نعمانی کا استثنیٰ نہیں ہے۔ سیاسی امور میں علامہ شبلی ترکی خلافت کے مداح اور کانگریس کے حامی تھے۔ اس کے بخلاف سرسید انگریزی حکومت سے مکمل تعاون کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی پسپائی کے نتیجے میں مسلمانوں کی تباہی کا مداوا اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہوکر ہمہ تن حصول تعلیم میں مشغول ہوجاتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ان دونوں کے سیاسی اختلافات کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ سرسید شخصی طرز حکومت کو ترجیح دیتے تھے اور علامہ شبلی جمہوری نظام حکومت کو۔[۲۵] ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگرچہ علامہ شبلی نے

اپنے سفرنامہ مصر و روم و شام میں حتی الامکان سیاسیات کے ذکر سے پہلوتہی کی تھی تاہم علی گڑھ کی سیاست اس کی بھی روادار نہیں ہوسکی تھی۔ دراصل کسی ادارے کو چلانے کے لیے حکومت وقت کا تعاون خصوصاً اس صورت میں کہ وہ ادارہ حکومت سے امداد بھی لیتا ہو، ناگزیر ہے۔ خود علامہ کو بھی پہلے ایم۔ اے۔ او کالج اور پھر ندوۃ العلماء سے وابستگی کے دوران اپنی سیاسی آراء میں اعتدال پیدا کرنا پڑا تھا اور بعض ایسے امور انجام دینے پڑے تھے جو وہ شاید آزادانہ زندگی گزارنے کی صورت میں انجام نہ دیتے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ ان کا رجحان ان کے حبیب لبیب مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی شہادت کے مطابق "جدید سیاسی تحریک" یعنی کانگریس کی قومی تحریک کی جانب ہوگیا تھا۔[۲۶] اور وہ صدر اسلام کی روایات کے بموجب جمہوری نظام حکومت کو پسند کرتے تھے۔

(باقی)

حواشی

[۱] مہدی افادی: افادات مہدی، حیدرآباد، ۱۹۵۶: ۲۲۷ [۲] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳: ۲۲۰ [۳] ایضاً: ۲۲۰ [۴] ایضاً: ۲۲۱ [۵] ایضاً: ۲۲۲ [۶] ایضاً: ۲۲۶ [۷] مقالات شبلی ج ۱، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴: ۲۲۵ [۸] ابوالکلام آزاد و صدر یار جنگ: کاروان خیال، بجنور، ۱۹۴۶: ۹۴ [۹] حیات شبلی: ۲۰۳ [۱۰] ایضاً، مقابل ص ۲۲۰ [۱۱] ایضاً: ۲۰ [۱۲] حبیب الرحمن خاں شروانی: مقالات شروانی، علی گڑھ ۱۹۴۸: ۹۰-۹۱ [۱۳] حیات شبلی: ۱۳۹ [۱۴] ایضاً: ۱۳۹-۱۴۰ [۱۵] ایضاً: ۱۱۱-۱۱۷ [۱۶] ایضاً: ۱۱۸ [۱۷] ایضاً: ۱۲۲ [۱۸] شیخ محمد اکرام: یادگار شبلی، لاہور ۱۹۹۴: ۸۱ [۱۹] حیات شبلی: ۱۳۲-۱۳۹ [۲۰] ایضاً: ۱۴۰ [۲۱] یادگار شبلی: ۸۰ [۲۲] ایضاً: ۸۳ [۲۳] حیات شبلی: ۲۳-۲۷ [۲۴] پروفیسر ثریا حسین: سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، علی گڑھ ۱۹۹۳: ۱۵۳۰ [۲۵] حیات شبلی: ۲۹۴ [۲۶] حیات شبلی: ۲۹۸

عباسی عہد کا مشہور زہدیہ شاعر۔ ابوالعتاہیہ

از جناب عبدالجبار صاحب۔ علی گڑھ

(۲)

ابوالعتاہیہ کی زہدیہ شاعری

ابوالعتاہیہ کے مفصل حالات تحریر کرنے کے بعد ہم اب اس کی زہدیہ شاعری پر بحث و تبصرہ کرنا مقصود ہے، لیکن اس سے قبل ابوالعتاہیہ سے پہلے کی عربی شاعری میں بھی زہد کا عنصر تلاش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جاہلی شاعری میں زہد کا عنصر دور جاہلیت کے شعرار کو ہم تین طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) یہودی و نصرانی شعراء، (۲) حنیفی یعنی حضرت ابراہیم کو ماننے والے شعراء، (۳) بت پرست اور مشرک شعراء۔

اول الذکر دونوں طبقوں کے شعراء کے کلام میں دنیا سے بے رغبتی، آخرت کے لیے فکرمندی، قبر اور حشر و نشر کے تذکرے، دنیا کی ناپائداری اور انسانی زندگی کی ناپائداری وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ کائنات کا ایک خالق ہے جس کی عبادت کرنی چاہیے، مرنے کے بعد انسان کو اپنے اعمال کی جزا سزا ملے گی۔ اس لیے آخرت کی تیاری اور نیک اعمال کی جانب بیش از بیش توجہ کرنی چاہیے، اسی تصور نے زہدیہ افکار و خیالات کو جنم دیا اور ہر مکتبۂ فکر کے شعراء نے اپنے عقیدہ و نظریہ کے

مطابق اپنی شاعری میں زاہدانہ افکار و خیالات پیش کیے۔ اس اعتبار سے نصرانی شعراء میں قس بن ساعدہ الایادی امیہ ابن ابی الصلت، عدی بن زید، اور طرفہ ابن العبد کا نام سرفہرست ہے۔ امیہ و بن ابی الصلت کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

الست ترى فيما مضى لك عبرة   فمه لا تكن يا قلب اعمى ملددا

فكن خائفا للموت والبعث بعده   ولا تك ممن غره اليوم و غد

فانك فى دنيا غرور لاهلها   وفيها عدو كاشح الصدر يوقد[1]

ان اشعار میں شاعر دنیا کے رنگ بدلتے حالات اور انسانی احوال کے انقلاب کا ذکر کرنے کے بعد موت سے ڈرنے اور آخرت کی تیاری کی دعوت دیتا ہے اور ساتھ ہی دنیا کے دھوکے سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کو ماضی پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ جس طرح وہ ختم ہو گیا اسی طرح کا حال اس کا بھی ہونے والا ہے۔

حنفیت سے تعلق رکھنے والے شعراء میں زہیر بن ابی سلمی، لبید بن ربیعہ کا نام زہدیہ افکار و خیالات پیش کرنے میں زیادہ مشہور ہے۔ خاص طور پر زہیر بن سلمی مواعظ و حکم بیان کرنے میں بہت ممتاز ہے۔ اسے صلح و آشتی کا پیامبر کہا جاتا ہے، لبید بن ربیعہ کی شاعری میں صوفیانہ رنگ زیادہ غالب ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائداری کا ذکر ہے، اشعار ملاحظہ کیجیے:

بلينا وما تبلى النجوم الطوالع   وتبقى الديار بعدنا والمصانع

فلا جزع ان فرق الدهر بيننا   فكل امرئ يوما به الدهر فاجع

وما المرء الا كالشهاب وضوئه   يحور رمادا بعد اذ هو ساطع[2]

[1] شعراء النصرانیہ الاب لویس شیخو الیسوعی، ۲۸۲/۱ [2] المقید فی الادب العربی، ص ۵۱۳۔

(ترجمہ: ہم ایک دن ختم ہوجائیں گے مگر دنیا کی چیزیں ایسے ہی برقرار رہیں گی اور زمانے نے اگر ہمارے درمیان جدائی کر دی ہے تو گھبرانے کی بات نہیں، اس لیے کہ ہر ایک کا یہی حال ہونا ہے اور انسان کا حال چمکنے والے ستارہ کی طرح ہے کہ وہ چمکتا ہے اور ختم ہوجاتا ہے۔

جاہلی دور کی زہدیہ شاعری کے خاص موضوعات یہی ہیں، دنیا اور حیات انسانی کی بے اعتباری، انقلاب زمانہ، ماضی سے عبرت، موت کا استحضار وغیرہ۔

صدر اسلام میں زہدیہ افکار جاہلی اقدار کے ظلمت کدہ میں جب اسلام کی روشنی نمودار ہوئی تو اہل عرب کے اندر نئے خیالات نے جنم لیا، معیشت و سیاست کا ڈھانچہ تبدیل ہوگیا، معاشرت کے طور طریقے بدل گئے، اور عقائد کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اسلام نے لوگوں کو صلاح و تقویٰ اور اخروی زندگی کی طرف راغب کیا، اسی کے ساتھ دنیا کی بے ثباتی اور اس سے نفرت و حقارت کی تعلیم دی، ارشاد باری ہے:

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ[1]

تم کو دنیاوی زندگی دھوکہ میں نہ ڈال دے اور نہ تم کو وہ دھوکہ باز (شیطان) اللہ سے دھوکہ میں رکھے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا:

اللّٰھم لا عیش إلا عیش الآخرۃ[2]

حقیقی عیش اور زندگی تو آخرت ہی کی ہے۔

اس قسم کی آیات اور احادیث بے شمار ہیں، لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ مذہب اسلام دنیا کو بالکل چھوڑ دینے اور اس کی نعمتوں سے دست کش ہوجانے کی دعوت

[1] سورۂ لقمان: ۳۳ [2] کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق، ج ۲، ۵۸۸۔

دیتا ہے بلکہ ارشاد ربانی ہے:

كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا[1]

اللہ کی دی ہوئی حلال اور طیب چیزوں میں سے کھاؤ۔

تاہم جو مسلمان تقویٰ اور رضائے الٰہی کے طلبگار ہوتے ہیں وہ دنیاوی لذات اور مرغوبات نفس سے کنارہ کش رہتے ہیں، اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے ہیں اور ایک مسافر کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور دنیا اور اس کی دلفریبیاں ان کی نظر میں بہت ہی حقیر اور معمولی ہوجاتی ہیں۔

ادیان سابقہ کے زہاد کی رہبانیت اور تیاگ اسلام میں ممنوع ہے، اسنے اور چیزوں کی طرح زہد کے اندر بھی اعتدال قائم رکھا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَابْتَغِ فِيْمَا اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا"[2] دنیا کے سب سے بڑے زاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ان کا اسی پر عمل تھا، ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک شخص نے آکر عرض کیا، یا رسول اللہ مجھے ایسے عمل کی تلقین فرمایئے جس کی وجہ سے اللہ اور اس کے بندے مجھ سے محبت کرنے لگیں، حضورؐ نے فرمایا:

ازھد فی الدنیا وازھد فیما عند الناس یحبک الناس[3]

دنیا سے اور جو لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہوجا لوگ تجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔

انہیں تعلیمات کے نتیجہ میں صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت نے زہد و تقویٰ کی زندگی اختیار کر لی تھی، جن میں اصحاب صفہ کو خاص امتیاز حاصل ہوا جو ہمہ وقت ذکر و تلاوت

[1] سورۃ النحل: ۱۱۴ [2] سورۃ القصص: ۷۷ [3] البیان والتبیین ص ۱۶۶/۳۔

اور اللہ کی عبادت ہی میں مشغول رہتے تھے، دوسرے صحابہ کرام حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ وغیرہم نے بھی زاہدانہ زندگی پسند کی، اکثر لوگ دن میں روزہ رکھتے اور راتوں کو قیام میں گزارتے

اموی عہد میں زہدیہ افکار

لیکن جب اسلامی فتوحات کا دور شروع ہوا اور صحابۂ کرامؓ کی تعداد بھی روز بروز کم ہونے لگی، دنیا کی نعمتوں اور قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا ڈھیر لگ گیا تو مال و دولت کی جانب لوگوں کی رغبت بھی بڑھنے لگی اور فکر آخرت سے بھی لوگ غافل ہونے لگے تاہم اس زمانے میں بھی کچھ ایسے لوگ ضرور موجود رہے جو زہد و تقویٰ کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے اور عام لوگوں کو بھی اسی کی وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ ان زہاد و نساک میں حضرت حسن بصریؒ اور رابعہ العدویہ بہت مشہور رہیں، جن کا معاشرہ پر گہرا اثر پڑا، یہاں تک کہ بعض شعرا بھی ان کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور انہوں نے زہدیہ اشعار کہے جیسے عروہ ابن اذینہ، مسکین الدارمی، ابوالاسود الدوئلی، سابق البربری وغیرہ۔

ابوالاسود الدوئلی مشہور تابعی اور ایک صالح و متقی انسان تھے، ان کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا، ان کے اشعار پر زہدیہ افکار و خیالات چھائے ہوئے ہیں، کہتے ہیں:

واذا طلبت من الحوائج حاجۃ	فادع الالٰہ واحسن الاعمالا
فلیعطینک ما اراد بقدرۃ	فھو اللطیف لما اراد فعالا
ان العباد و شأنھم وامورھم	بید الالٰہ یقلب الاحوالا[1]

(جب بھی کوئی چیز طلب کرنی ہو تو اللہ ہی سے طلب کرو اور نیک اعمال کرو، جب اللہ سے خلوص سے مانگو گے تو وہ ضرور عطا کرے گا کیونکہ وہ بہت بڑا مہربان ہے اور جس چیز کا ارادہ کر لیتا ہے بس

[1] اغانی، ص ۲۹۷/۱۲۔

وہ چیز ہو جاتی ہے، بندے اور ان کے تمام احوال و معاملات اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہی احوال کو بدلتا رہتا ہے۔

سابق البربری عہد اموی میں موصل کے قاضی اور امام تھے، ان کا شمار بھی اس دور کے زہاد اور نساک میں ہوتا ہے، انہوں نے اپنے اشعار میں زیادہ تر تقویٰ، دنیا سے بے رغبتی، موت وغیرہ جیسے مضامین کو ہی بیان کیا ہے اور امرا اور مالداروں پر سخت تنقید کی ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:

فحتی متی تلھو بمنزل باطل	کانک فیہ ثابت الاصل قاطن
وتجمع مالا تاکل الدھر دائما	کانک فی الدنیا لغیرک خازن[1]

کب تک تو اس دھوکہ کی جگہ (دنیا) میں لہو و لعب میں مبتلا رہے گا، گویا کہ یہی تیرا اصلی مسکن ہے اور تو اس میں ہمیشہ رہے گا اور تو ایسے مال و دولت کو جمع کر رہا ہے جس کو تیرے بعد آنے والے کھاتے رہیں گے گویا کہ تو دنیا میں دوسروں کے خازن کی طرح ہو۔

یہ زمانہ چونکہ حضورؐ کے دور سے قریب تھا اور لوگوں پر آپ کی تعلیمات کا اثر غالب تھا، اس لیے شعرا کا بھی ان سے متاثر ہونا ایک طبعی چیز تھی چنانچہ ان کے اشعار میں قبر و حشر، موت و حیات، ثواب و عقاب اور زوال دنیا وغیرہ کا ذکر ملتا ہے مگر اس کے باوجود کسی شاعر نے بھی زہد کو ایک مستقل باب یا فن کی حیثیت سے نہیں پیش کیا۔

عباسی عہد میں زہد کا عنصر

عباسی عہد میں معاشرہ میں فسق و فجور، بے شرمی و بے حیائی، شراب و کباب کی محفلیں، غلام باندیوں کی کثرت، مختلف اقوام اور تہذیبوں سے اختلاط کی بنا پر بہت سی خرابیاں اور غلط چیزیں پیدا ہو رہی تھیں اور ان کی ترجمانی کرنے والے

[1] تاریخ ابن عساکر: علی بن حسن بن ہبۃ اللہ، ص ۳۸/۶۔

شعراء بھی ماحول کو گرمائے ہوئے تھے لیکن ظاہر ہے ہر طرف خرافات ہی کا دور دورہ نہ تھا بلکہ یہ سب ایک خاص طبقہ تک محدود تھا، جن کی اکثریت عجمیوں کی تھی۔

اس کے برخلاف صلحاء زہاد اور واعظوں کی بھی کثیر تعداد تھی جو معاشرہ کی اصلاح اور وعظ و ارشاد کا کام انجام دے رہے تھے۔ خلفائے عباسیہ کے ابتدائی دور میں بہ کثرت عباد اور زہاد موجود تھے جو خالص تقویٰ اور زہد کی زندگی بسر کر کے دنیا اور اس کی فانی چیزوں سے قطع تعلق کیے ہوئے تھے، مثلاً سفیان بن عیینہ، فضیل بن عیاض، مالک بن دینار، عبداللہ ابن مبارک وغیرہ۔ شعراء کی بھی کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جو زہدیہ افکار کے ترجمان تھے، مثلاً محمد بن کناسہ، محمود الوراق، ابو نواس اور ابوالعتاہیہ وغیرہ۔ پہلے محمود وراق کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تعصی الالہ وانت تظہر حبہ　　　هذا محال فی القیاس بدیع

لوکنت تضمر حبہ لاطعتہ　　　ان المحب لمن احب مطیع[1]

تو اللہ سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے اور نافرمانی بھی کرتا ہے، یہ طریقہ عقلاً محال ہے، اس لیے کہ اگر تیرے دل میں اس کی محبت ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا، کیونکہ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس کا فرمانبردار بھی ہوتا ہے۔

ابو نواس اپنے دور کے صف اول کے شعراء میں تھا، شعرائے محدثین میں اس کے سب سے بڑے شاعر ہونے پر اتفاق عام ہے، خمریات میں اس کے پایے کا کوئی شاعر نہیں گزرا، مگر یہ امر بھی متفق علیہ ہے کہ اس کی عمر کا زیادہ حصہ لہو و لعب اور فسق و فجور کی محفلوں میں گزرا، لیکن عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی فسق و فجور چھوڑ کر اللہ کی

[1] عقد الفرید: ابن عبد ربہ، ص ۳۲۵/۳۔

طرف رجوع ہوتا ہے تو وہ صدق دل سے رجوع ہوتا ہے، ابو نواس کا بھی یہی حال ہے، جب اس میں توبہ و انابت کی کیفیت پیدا ہوئی تو وہ اپنی کرتوتوں پر پچھتانے اور اللہ کے سامنے صدق و اخلاص سے توبہ و استغفار کرنے لگتا ہے اور کبھی اپنی سابقہ زندگی کو اختیار کرنے کا دل میں خیال بھی نہیں لاتا، بلکہ مرتے دم تک توبہ و استغفار پر قائم رہتا ہے اور لوگوں کو بھی اس کی دعوت دیتا ہے، لیکن ابو نواس کا زہدیہ کلام بہت کم ہے، تاہم جس قدر ہے اس میں ندامت اور توبہ و استغفار کا رنگ غالب ہے، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

یارب ان عظمت ذنوبی کثرۃ　　　فلقد علمت بان عفوک اعظم

ان کان لا یرجوک الا محسن　　　فبمن یلوذ و یستجیر المجرم

ادعوک رب کما امرت تضرعا　　　فاذا رددت یدی فمن ذا یرحم[1]

اے میرے اللہ میں بہت بڑا گنہگار ہوں لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا عفو و درگزر اس سے بھی بڑھ کر ہے، مجرم اور گنہگار اپنے محسن سے ہی امید لگاتا ہے، اگر محسن معاف نہیں کرے گا تو مجرم کو کون پناہ دے گا، اے میرے خدا میں عاجزانہ تیرے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں جیسا کہ تیرا حکم بھی ہے، اگر تو نے خالی ہاتھ واپس کر دیا تو پھر کون رحم کرے گا یعنی تیرے علاوہ ٹھکانہ نہیں ہے۔

ابوالعتاہیہ کے زہد کا پس منظر اس پر عام اتفاق ہے کہ ابوالعتاہیہ زہدیہ شاعری کے لیے وقف ہو گیا تھا، اس کی جد و جہد اور کاوش سے یہ عربی ادب کی ایک مستقل صنف ہو گئی تھی، لیکن پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ کن اسباب و علل کی بنا پر اس کے اندر یہ

[1] دیوان ابو نواس: ص ۱۹۹۔

تبدیلی بلکہ انقلاب عظیم آیا اور وہ عام شعراء کی روش ترک کرکے زہدیہ شاعری کے راستہ پر گامزن ہوا، اکثر تذکرہ نگاروں اور مورخین کا خیال یہ ہے کہ عتبہ نامی باندی کی محبت میں ناکامی کے باعث اس نے سب کچھ خیرباد کہہ کر یہ راستہ اپنالیا تھا، صاحب مروج الذہب نے لکھا ہے:

ان ابا العتاهية لبس الصوف	کہ ابوالعتاہیہ عتبہ سے مایوس ہوکر
لیاسه من عتبة [1]	ہی تصوف کے لبادہ میں آیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر کی خود فطری حالت و کیفیت اس تغیر و انقلاب کا ذریعہ بنی ہو جیسا کہ اس کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی خاندانی پستی، غربت و افلاس اور ذلت و رسوائی کو زائل کرنے کے لیے دنیا کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس نے بھی یاوری نہیں کی جس کے نتیجہ میں دنیا اور اہل دنیا سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہوگئی اور ان احساسات کا اس پر اتنا غلبہ ہوا کہ اس نے اسی کو اپنی شاعری کا موضوع بنالیا اور زندگی بھر امارت اور امیروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا رہا۔ اشعار دیکھئے:

یامن بنی القصر فی الدنیا وشیدہ	اسست قصرک حیث السل والغرق
والموت حوض کریه انت واردہ	فانظر لنفسک قبل الموت یامذق [2]

اے وہ شخص جو اس دنیا میں خوبصورت محلات کی تعمیر میں لگا ہوا ہے تو نے اپنے محل کی بنیاد غلط جگہ پر رکھی ہے، یعنی یہاں ٹھہراؤ نہیں ہے، یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے، موت ایک خوف ناک گڑھا ہے اور تجھے اس میں ایک دن گرنا ہے، پس موت سے پہلے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرلے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے زمانے کے اثرات کے تحت اس کے اندر زہد کا داعیہ اور

[1] مروج الذہب: ابوالحسن علی ابن الحسین، ج ۳ ص ۲۸۲ [2] الدیوان ا ص ۱۷۲۔

اس کی طرف رجحان و میلان پیدا ہوا کیونکہ اس کے عہد میں زہاد و نساک کا سکہ جما ہوا تھا، وہ عوام کے دلوں میں ان کی کافی عزت اور مقبولیت تھی اس لیے اس نے بھی عوام میں شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہو، وجہ جو بھی رہی ہو اس میں شبہ نہیں کہ اس نے زہدیہ شاعری کو بڑی آب و تاب بخشی اور ایک نیا انداز و اسلوب پیدا کیا۔

عکرمہ کا بیان ہے کہ خلیفہ امین کی بیعت کے سال میں بغداد کی ایک مسجد میں داخل ہوا تو ایک بوڑھے آدمی کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھا جو یہ اشعار پڑھ رہا تھا:

ذهب الشباب وبان عنی	غیر منتظر الایاب
انی لآمل ان اخلد	والمنیة فی طلاب [1]

شباب چلا گیا اور ایسا گیا کہ اب لوٹ کر آنے کی امید بھی نہیں، بندہ یہ خواہش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی دنیا میں رہے اور موت اس کی تلاش میں لگی ہوئی ہے۔

اشعار پڑھتے وقت اس کے چہرے پر آنسو رواں تھے، عکرمہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اشعار لکھ لیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شیخ ابوالعتاہیہ تھے۔

جب ابوالعتاہیہ نے زہدیہ زندگی اختیار کی اور اپنے کلام کا رخ ہر طرف سے موڑ کر صرف زہد کی طرف کردیا تو اس کو اس کی خواہش ہوئی کہ وہ اس میدان میں منفرد ہی رہے، کوئی دوسرا شخص اس کی ہمسری نہ کرسکے، اسی لیے اس نے ابونواس سے اس کی خواہش کی کہ وہ زہدیہ اشعار نہ کہے اور مجھے اس میں طبع آزمائی کرنے دے، مخلد الطائی کا بیان ہے "جانی ابوالعتاهیه فقال لی ان ابانواس لایخالفک

[1] اغانی: ج ۴ ص ۴۶

وقد احببت ان تسالہ ان لا یقول فی الزھد شئیا. فانی قد ترکت لہ المدایح والھجا والخمر والرقیق ومافیہ الشعراء والزھد شوقی[1] (کہ میرے پاس ابوالعتاہیہ آیا اور کہا کہ ابونواس تمہاری مخالفت نہیں کریں گے، تم ان سے کہدو کہ وہ زہدیہ شاعری نہ کرے اس لیے کہ میں نے مدح و ذم خمریات و غزلیات سب ان کے لیے چھوڑ دیا ہے زہد میرا شوق ہے)

ابوالعتاہیہ نے اس میدان میں قدم رکھا تو آخر تک اس میں طبیعت کی جولانی دکھاتا رہا، مگر افسوس کہ تیس[30] سال کے عرصے کا کلام دستیاب نہیں ہے۔

ابوالعتاہیہ کا زہد اور معاصرین کے شبہات کچھ لوگوں نے ابوالعتاہیہ کے زہد کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے، جس کی تفصیل اس کے حالات کے ضمن میں قلم بند کی جاچکی ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ ابوالعتاہیہ حقیقی اور اصطلاحی زاہد اور صوفی نہیں تھا، بلکہ وہ صرف فنی نقطۂ نظر زہد کے اندر طبع آزمائی کرتا تھا، ابوالعتاہیہ نے اپنے اشعار کا موضوع خاص حالات کے اندر زہد کو بنایا تھا، لوگ سمجھ بیٹھے کہ یہ کہنے کے مطابق عملی طور پر بھی زاہد ہی ہوگا، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

زہدیہ شاعری میں ابوالعتاہیہ کا عام فہم اسلوب ابوالعتاہیہ کی مقبولیت میں جہاں اسکی زہدیہ شاعری کو دخل ہے وہاں اس کا اسلوب بھی بڑی جاذبیت اور کشش رکھتا ہے۔ وہ روزمرہ کی زبان ہی استعمال کرتا ہے اور اسے غرابت، تعقید اور عجمیت سے بھی بچائے رکھتا ہے تاکہ عام لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکیں، اپنی پوری شاعری ہی میں ابوالعتاہیہ نے سہل پسندی سے کام لیا ہے اور مشکل و ثقیل زبان سے احتراز کیا ہے، لیکن شاعری میں خاص طور پر اس کا التزام کیا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ ابن ابی الابیض کے

[1] اخبار ابی نواس: ابن منظور، ص ۶۵۔

پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں بھی زہدیہ شاعری میں دلچسپی رکھتا ہوں، کچھ اشعار بھی کہے ہیں اور اس موضوع کو پسند بھی کرتا ہوں، آپ کے اشعار بھی سُنے ہیں اور مزید سُننے کا خواہش مند ہوں، اس لیے زہد کے سلسلے میں آپ اپنا عمدہ کلام سُنائیے، ابوالعتاہیہ نے اس سے کہا کہ تمہاری شاعری پست درجہ کی ہے، اس نے کہا کیسے؟ ابوالعتاہیہ نے کہا کہ شاعری یا تو قدیم شعراء کے طرز پر ہونی چاہیے یا پھر بشار اور ابن صرفہ کے طرز پر، اگر اس درجہ کا کلام نہیں ہے تو پھر شاعر کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ عام فہم کلام کہے، جیسا کہ میرے اشعار ہیں، اس میں بھی زہدیہ اشعار کو خصوصیت حاصل ہے، اس لیے کہ زہد بادشاہوں، شعر کے راویوں اور نئی چیزوں کے طلبگاروں کا مذہب و مسلک نہیں ہے بلکہ یہ ان لوگوں کا مسلک ہے جو اس سے دلچسپی رکھتے ہوں، اس لیے اسے ان کے لیے لائق فہم ہونا چاہیے۔ ابن الابیض نے کہا! آپ نے سچ کہا، پھر ابوالعتاہیہ نے اپنے زہدیہ اشعار سُنائے، دیکھئے:

لدوا للموت وابنوا للخراب — فکلم یصیر الی تباب

الا یا موت لم ارمنک بدا — اتیت وما تحیف وما تحاب

کانک قد ھجمت علی مشیتی — کما ھجم المشیب علی شباب[1]

تم موت کے لیے جنتے ہو اور ویرانی کے لیے عمارتیں بناتے ہو کیونکہ تم میں سے ہر ایک کا انجام تباہی و بربادی ہے، اے موت میں نے نہیں دیکھا کہ تو آئی ہو اور تونے ظلم و زیادتی نہ کی ہو، گویا کہ تو بوڑھاپے پر ایسے حملہ آور ہوتی ہے جیسے جوانی پر بوڑھاپا۔

ابوالعتاہیہ کا کلام زہدیہ افکار و معانی سے پر ہے، دنیا کا زوال حیات انسانی

[1] اغانی، ج ۴، ص ۲۴۔

کی ناپائداری، زمانے کا ظلم و ستم، موت و قبر و حشر کا تذکرہ، طمع و حرص کی خرابیاں، تقویٰ و پرہیزگاری کی ترغیب، آخرت کے لیے تیاری، صبر و قناعت اور اعمال خیر پر تحریص وغیرہ اس کی زہدیہ شاعری کا اصل موضوع ہیں

عام طور پر ابو العتاہیہ کی زہدیہ شاعری کا رنگ واعظانہ ہے جس میں کبھی قرآنی آیات، کبھی احادیث شریفہ، کبھی شعراء کے کلام اور حکماء اور دانشمندوں کے اقوال سے بھی استدلال کرتا ہے۔

دنیا کے زوال اور اس کے دھوکہ سے بچنے کے بارے میں کہتا ہے:

الا نحن فی دار قلیل بقاؤها   سریع تداعیها وشیک فناؤها

غداً تخرب الدنیا ویذهب اهلها   جمیعاً وتطوی ارضها وسماؤها[1]

(ہم ایسی جگہ (دنیا) میں قیام پذیر ہیں کہ جس کا بقا بہت کم ہے اور فنا و زوال بہت قریب ہے، کل یعنی قیامت کے دن یہ دنیا ویرانی میں بدل جائے گی اور تمام اہل دنیا ختم ہو جائیں گے، زمین و آسمان کو لپیٹ دیا جائے گا۔

دنیا کی حقارت اور نفرت کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے:

الا انما الدنیا علیک حصار   نیالک فیها ذلة وصغار

وما لک فی الدنیا من الله راحة   ولا لک فیها ان عقلت قرار[2]

(دنیا تیرے اردگرد ایک ایسا حصار ہے کہ اس میں کچھ حاصل کرنا بھی ذلت و رسوائی ہے، دنیا میں انسان کتنی بھی جد و جہد کر لے، لیکن اگر تجھ میں عقل ہے تو سمجھ لے کہ اس میں قرار نہیں ہے۔)

کبھی کہتا ہے کہ یہ دنیا دھوکہ باز ہے، کتنے انسانوں کو اس نے ہلاک کر دیا لیکن

---

[1] دیوان ابی العتاہیہ، ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۱۸۶۔

انسان بھی عجیب ہے اس کے مکر اور دھوکہ کو جاننے کے باوجود اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اشعار دیکھیے:

لا تأمن من الدنیا علی غدرها   فکم غدرت من قبل امثالها

فانظر سبیلاً سلکوا ولا   تحسب بان لست له سالکاً[1]

(دنیا کی بے وفائی سے بے فکر مت رہو، اس لیے کہ تجھ سے پہلے نامعلوم کتنوں کے ساتھ یہ غداری کر چکی ہے اور اس راستہ پر نظر رکھ جس پر وہ لوگ چلے ہیں، یہ مت گمان کر کہ تجھے اس راستہ پر نہیں جانا ہے۔)

حرص و طمع کے بارے میں کہتا ہے کہ اپنے ورثاء کے لیے مال جمع کرنے سے کیا فائدہ؟ اسے اللہ کی رضامندی کے لیے خرچ کرو۔

یا جامع المال فی الدنیا لوارثه   هل انت بالمال بعد الموت تنتفع

لا تمسک المال واسترض الاله به   فان حسبک منه الری والشبع[2]

(اے دنیا میں اپنے ورثاء کے لیے مال جمع کرنے والے کیا مرنے کے بعد یہ مال تجھے کوئی فائدہ دے گا، مال کو جمع کر کے مت رکھ اور اللہ کی رضا طلب کر اور گزارہ کے بقدر روزی پر قناعت کر)

قناعت کے بارے میں کہتا ہے:

ما شرف المرء کالقناعة لقناعة   والصبر علی کل حادث یقع

لم یزل القانعون اشرفنا   یا حبذا القانعین ما قنعوا[3]

(زمانے کے حوادث پر صبر اور قناعت سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی شرف نہیں ہے اور قناعت کرنے والے ہمیشہ عزت و شرف والے ہوتے ہیں۔)

---

[1] دیوان ابی العتاہیہ، ص ۱۸۶ [2] ایضاً ص ۲۳۹ [3] ایضاً ص ۱۵۶۔

موت سے ہر ایک آدمی لرزہ براندام رہتا ہے۔ تقریباً سبھی زہاد ونساک نے اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس سے لوگوں کو ڈرایا ہے، ابوالعتاہیہ نے بھی مختلف زاویوں سے اپنے اشعار میں اس کا تذکرہ کیا ہے، کبھی موت کی ہولناکیوں کا ذکر کرتا ہے تو کبھی قبر کے اندھیرے کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے موت سے متعلق اشعار میں تین قسم کے نظریات ملتے ہیں، (۱) موت کا خوف اور ڈر (۲) اس کی عمومیت (۳) اور اسکا تذکرہ اس کو موت کا کھٹکا ہر دم متفکر رکھتا ہے اور مختلف انداز میں اسکا تذکرہ کرکے وعظ و نصیحت کرتا ہے:

مالی رایتک راکبا لھواکا   اظننت ان اللہ لیس یراکا

انظر لنفسک فالمنیۃ حیث ما   وجھت واقفۃ ھناک حذاکا[1]

(میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو غفلت کی سواری پر سوار ہے اور کیا تو نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے نہیں دیکھ رہا ہے، اپنے نفس کا دھیان رکھ اس لیے کہ موت ہر وقت تیرے ساتھ ساتھ ہے)

کبھی کہتا ہے کہ موت کا خوف اور ڈر جو اس پر غالب آچکا ہے، اس کے علاوہ کوئی خوف اور ڈر ہی نہیں ہے۔

واصبح لی فی الموت شغل عن الصبا   وفی الموت شغل شاغل لذوی العقل

اذا انا لم اشغل بنفسی فنفس من   من الناس ارجوان یکون بھا شغلی[2]

(بچپن سے ہی موت میرے لیے ایک مشغلہ بن چکی ہے اور موت کے بارے میں عقلمند لوگ ہی متفکر رہتے ہیں اور اگر میں اپنے نفس کو موت کے سلسلے میں متفکر نہ رکھوں تو پھر کسی سے

[1] دیوان، ص ۱۸۳ [2] ایضاً: ص ۲۰۳۔

کیا توقع کروں کہ وہ اس کی جانب سے متفکر رہے)

کبھی کہتا ہے کہ موت سب کے لیے ہے اس سے کوئی نہیں بچ سکتا، بڑے چھوٹے، کمزور اور قوی سب کو اس کا مزہ چکھنا ہے، اشعار دیکھئے:

الموت بین الخلق مشترک   لاسوقۃ یبقی ولا ملک

الم یختلف فی الموت مسلکھم؟   لا بل سبیلا واحدا سلکوا[1]

(موت ہر کسی کو آتی ہے چاہے راجہ ہو یا پرجا، اس کے گھاٹ پر جانے کے لیے کسی کا راستہ مختلف نہیں ہے سبھی کو اسی ایک راستے سے گزرنا ہے)

الست تری للدھر نقضا وابراما   فھل تم عیش لامری او دواما

ونحن مع الایام حیث تقلبت   فترفع اقواما وتخفض اقواما[2]

(کیا تو نے زمانے کی بدعہدی اور استحکام نہیں دیکھا، کیا کسی آدمی کی خواہشات پوری ہوتی ہیں یا ہمیشہ رہتی ہیں اور ہم گردش ایام اور حوادث کے شکار ہوتے رہتے ہیں، زمانہ کسی قوم کو بلند کرتا ہے تو دوسری کو ذلیل و رسوا کرتا ہے)

زہدیہ شاعری میں ابوالعتاہیہ کا درجہ

ابوالعتاہیہ کو زہدیہ شاعری میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، وہ زہدیات کا امام اور قائد مانا جاتا ہے، اس نے اسے بام عروج پر پہونچادیا اس کی شاعری کا یہ بھی کمال ہے کہ وہ سامع کے ذہن و دماغ کو متاثر کرتی ہے، خاص طور پر جب وہ قبر و حشر اور موت کے احوال کا تذکرہ کرتا ہے۔ عمدہ شاعری کی پہچان یہی ہے کہ وہ سننے والے پر اثر انداز ہو، ابوالعتاہیہ نے زہدیہ کلام کو پیش کرنے کا انداز نہایت آسان، دلکش اور دلپذیر اختیار کیا ہے، ابونواس نے جب اس کے یہ

[1] دیوان، ص ۱۸۶ [2] ایضاً ص ۲۴۱۔

اشعار سنئے:

لاترقدن لعینک السھر	وانظرالی ماتصنع الخبر
انظرالی غیر مصرفۃ	ان کان ینفع عینک النظر
واذاسالت فلم تجداحدا	فسل الزمان فعندہ الخبر[1]

تو بے ساختہ یہ کہنے لگا " افسحر ھذا ام انتم لا تبصرون" حالانکہ ان کے اندر کوئی خاص اور انوکھی بات نہیں کہی ہے، تاہم صرف زمانہ کے تقلب و تصرف کو ایک عمدہ پیرایے میں بیان کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ زمانے کے احوال پر نظر رکھنا انسان کے لیے لازم ہے۔

عمرو بن شیبہ کا بیان ہے کہ ایک عابد ایک، راہب کے پاس سے گزرا تو نصیحت کرنے کی درخواست کی، راہب نے کہا بھلا میں تم کو کیا نصیحت کروں! جبکہ تمہارے پاس قرآن کریم اور نبی آخر الزماں کی تعلیمات بھی ہیں اور آخر میں کہا کہ " فاتعظ ببیت بین شعر شاعرکم ابی العتاہیہ" اور یہ شعر پڑھا:

تجرد من الدنیا فانک انما	وقعت الی الدنیا وانت مجرد[2]

احمد امین لکھتے ہیں:

" اس نے زہد کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا اور ادب عربی کو اپنے زمانے میں موت کے خوف سے ڈر اور دنیا کی لذات سے نفرت و حقارت جیسے مضامین سے مالامال کردیا اور عام لوگوں کی رعایت سے آسان زبان استعمال کی ہے[3]

ابوالعتاہیہ کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ اس نے زہد کو شاعری کا ایک مستقل موضوع بنادیا ہے"۔

۱؎ ابوالعتاہیہ، محمد احمد برانق، ص ۵۳ ۲؎ ایضاً ص ۵۵ ۳؎ ضحی الاسلام، ج ۱ ص ۱۸۵۔

مکتوبات صدی کے نسخہ عہد مصنف کا عکسی ایڈیشن

از جناب شمیم منعمی صاحب، پٹنہ

(۲)

حاشیہ نگار کون؟ (الف) عسکری صاحب نے حواشی نگار مولانا مظفر بلخی کو اور ان کا کاتب مخدوم حسین بلخی کو بتایا ہے جو قابل قبول نہیں، مرتب نے نہ اس سے انکار کیا ہے اور نہ اسے تسلیم کیا ہے (ص ۱۱ تا ۱۳)

(ب) حواشی میں حضرت مخدوم جہاں کے لیے اور خود حاشیہ نگار نے اپنے لیے بالترتیب القاب و آداب اور عجز و انکسار کا مظاہرہ کیا ہے، اس پر پروفیسر عسکری صاحب نے سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ غیر مفید ہیں، کیونکہ انہوں نے پہلے ہی سے یہ نظریہ قائم کرلیا تھا کہ یہ حاشیے مولانا مظفر بلخی کے ہیں اور کاتب مخدوم حسین بن معز بلخی ہیں جبکہ ان حواشی کا مطالعہ کرنے سے پہلے اگر ہم کوئی نظریہ قائم نہ کریں بلکہ ان حواشی میں جو اسلوب پایا جاتا ہے اور جو طرز تخاطب و طرز بیان استعمال ہوا ہے، اسے مندرجۂ ذیل حضرات کی دستیاب نگارشات سے موازنہ کیا جائے تو صحیح نتائج تک پہنچا جاسکتا ہے۔

(۱) مولانا مظفر بلخی (۲) مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی (۳) حضرت زین بدر عربی۔

(ج) حاشیہ نگار نے حواشی میں اپنے لیے " بندۂ ضعیف"، " بیچارہ" کا استعمال بکثرت کیا ہے، غرضکہ حاشیہ نگار خود اپنے تئیں بندۂ ضعیف اور بیچارہ لکھنے کا عادی ہے۔ اس عادت کی تلاش جب ہم مکتوبات مولانا مظفر بلخی، مکتوبات مخدوم حسین بلخی، معدن المعانی، مخ المعانی، بحر المعانی، ملفوظ الصفا اور خود مکتوبات صدی کے مقدمہ میں

کرتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ حضرت مولانا مظفر بلخی اور حضرت مخدوم حسین بن معز بلخی بے چارہ اور بندۂ ضعیف کے موقع پر التزاماً "حقیر فقیر" کے عاجزانہ الفاظ استعمال میں لاتے ہیں۔ واضح رہے کہ حواشی مذکورہ میں کہیں بھی حاشیہ نگار نے اپنے لیے حقیر فقیر کا استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت زین بدر عربیؒ کے مرتب کردہ ملفوظات میں حاشیہ نگار کی طرح خود اپنے لیے بندۂ ضعیف، بے چارہ کا بکثرت استعمال ملتا ہے، صرف مکتوبات صدی کا مقدمہ جسے زین بدر عربیؒ نے ترتیب دینے کے بعد رقم فرمایا، اسے سامنے رکھا جائے تو میرے اندازے کی تائید ہو جاتی ہے۔

(د) حواشی میں حضرت مخدوم جہاں کے لیے "بندگی مخدوم" "مخدوم عظمہ اللہ" "خدمت شیخ" کے القاب و آداب کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ اس نہج پر بھی حضرت زین بدر عربیؒ کے جمع کردہ ملفوظات کا جائزہ لینے پر بہ نسبت دوسروں کے زیادہ یکسانیت ملتی ہے۔

(س) اس میں شبہ نہیں کہ مراتب کے لحاظ سے جو قربت حضرت مولانا مظفر بلخی کو حضرت مخدوم جہاں سے حاصل تھی، وہ کسی دوسرے کو نہیں تھی، لیکن بظاہر جو قربت شب و روز حضرت زین بدر عربی کو مخدوم جہاں کے حضور تھی وہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔

حضرت مخدوم جہاں کا کوئی ملفوظ، مخدوم کا کوئی علمی سرمایہ حضرت مولانا مظفر بلخی کا جمع کردہ نہیں ملتا جبکہ حضرت زین بدر عربی ہر وقت حاضر باش نظر آتے ہیں۔ جمع کرتے ہیں۔ مدون کرتے ہیں۔ بلکہ انہیں کاموں کے لیے وقف نظر آتے ہیں اور حضرت مخدوم بھی انکی مصروفیات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ بعض جگہ تو ان کی نگہداشت میں یہ کام عمل میں آتا رہا۔ خود مکتوبات صدی ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء میں حضرت زین بدر عربی نے ترتیب دی۔ اس پس منظر میں زیر تبصرہ نسخے کے حواشی کی مندرجہ ذیل عبارت پر نظر ڈالیے:

(۱) "ایں رباعی۔ مخدوم جہاں فرمودند۔ بنویس خارج مکتوب است۔ رباعی"۔۔۔

(ق ۳۱۹ الف)

(۲) "در کتاب ایں حاشیہ را داخل کنید"[1]

یہ خارج اور داخل کرنے کا حکم مولانا مظفر کے بجائے حضرت زین بدر عربی کو دیا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔

(۵) ان حواشی کو حضرت مولانا مظفر بلخی کا ماننے میں ایک اور بڑی قباحت یہ ہے کہ حواشی میں جن کتابوں کا حوالہ بطور ماخذ دیا گیا ہے ان میں دو خود حضرت مولانا مظفر بلخی کی مولفہ ہیں یعنی (۱) ترجمہ مشارق الانوار (۲) شرح العقیدہ اعنی شرح عقائد نسفی جس کا نسخہ قلمی خود خدا بخش میں موجود ہے، لیکن صفحہ اٹھارہ اور انیس پر ان دونوں کتابوں کے مصنفین سے لاعلمی کا اظہار کیا گیا ہے جو کہ افسوسناک ہے۔

حاشیہ نگار خود اپنی تالیف کا حوالہ دے سکتا ہے لیکن اس کا انداز جدا ہوتا۔

(و) عکسی ایڈیشن کا ایک حاشیہ بھی حاشیہ نگار پر کچھ روشنی ڈالتا ہوا نظر آتا ہے اس حاشیے کا جو ترجمہ عسکری صاحب نے فرمایا ہے[2]۔ اس سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں

(۱) دعا گوئے ضعیف (حاشیہ نگار) کا بہار سے تعلق تھا، جبکہ مولانا مظفر بلخی نہ صرف وطناً بلکہ مولداً بھی بلخی تھے، لیکن حضرت زین بدر عربیؒ کے بارے میں یہ قرینہ ہے کہ وہ اصلاً عربی ہوں گے لیکن بہار میں ان کا خاندان مدت سے آباد تھا۔

---

[1] پروفیسر حسن عسکری نے اپنے مضمون کے ص ۱۸ (عکسی ایڈیشن میں شامل ہے) پر اس کا حوالہ دیا ہے لیکن محولہ ورق پر عکس میں اس عبارت والا حاشیہ تا ایں دم تحریر نہیں مل سکا۔ ان کے مضمون کا صفحہ ۳۵ ملاحظہ ہو۔

(۲) حاشیہ نگار کی مالی حالت کمزور تھی۔

(۳) حاشیہ کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے مولانا مظفر بلخی کی شخصیت اس پر منطبق نہیں ہوتی۔

(۴) اس حاشیے میں مذکور "مولانا خواجہ" کا ذکر مغز المعانی (قلمی) میں بھی اس طرح ملتا ہے کہ اس ملفوظ کے جامع حضرت شہاب الدین عماد لکھتے ہیں:

"از جمع کردن مغز المعانی بجانب رفیع شیخ بزرگوار خود بواسطہ مولانا خواجہ عرضداشت والتماس نمود کہ نظر مخدوم جہاں بگذرد و از کمال شفقت ملتمس بیچارہ باجابت مقرون گردانید۔"

⑤ اس حاشیہ میں مذکور واقعہ کنز المعانی (قلمی) میں کچھ اس طرح ملتا ہے:

"سعادت آستانہ بوسی آستانہ علیا حاصل شد ذکرے در ہدیہ بردن افتادہ بود"

اس ملفوظ کے مرتب بھی زین بدر عربی ہیں۔

(ز) زیر تبصرہ عکسی ایڈیشن کے سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے اور وہ یہ کہ یہ نسخہ اس طرح ناقص الاول ہے کہ فہرست و متن مکتوبات سے قبل حضرت زین بدر عربی کا جو مقدمہ عام طور پر ملتا ہے، اس کے اخیر کا دعائیہ جملہ اور قطعہ و مناجات موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخے میں بھی حضرت زین بدر عربی کا مقدمہ موجود تھا۔

اس مقدمہ کا موجود ہونا بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ سنہ ۷۴۷ھ/ سنہ ۷۴۹ھ میں جبکہ یہ مکتوبات مکتوب الیہ قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کو ارسال کیے جا رہے تھے، حاضرین و خادمان بھی اپنے اپنے پاس اس کی نقلیں رکھتے تھے اور اسی ترتیب سے ہر صاحب کے پاس ان مکتوبات کا ایک ایک نسخہ جمع ہو گیا تھا۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ

ان میں سے ہر ایک نے حضرت زین بدر عربی کے مرتب کردہ مکتوبات کے نسخے سے ان کا مقدمہ بھی اپنے نسخے میں نقل کیا ہو۔ اسلیے بہت ممکن ہے کہ بعض نسخے مکتوبات کے ایسے بھی رہے ہونگے جو کہ بلاواسطہ زین بدر عربی، سیدھے حضرت مخدوم جہاں کی تحریر سے نقل بردار شتہ ہوں اور ان پر اس کے ناقل کا ترقیمہ یا اپنا پیش لفظ ہو۔ چنانچہ میری واقفیت میں مکتوبات صدی کے دو ایسے خطی نسخے ہیں جن میں زین بدر عربی کا مقدمہ شامل نہیں ہے۔

(۱) کتاب خانہ ریاست کپورتھلہ میں مکتوبات کا ایک ایسا نسخہ موجود ہے جس میں دیباچہ خود مکتوب الیہ حضرت قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کا ہے۔

(۲) جناب ڈاکٹر علی ارشد صاحب شرفی، گلزار ابراہیم بیینا سور بہار شریف کے پاس ۱۱۱۶ھ کا مکتوبہ ایک ایسا نسخہ مکتوبات صدی کا موجود ہے، جس میں زین بدر عربی کا دیباچہ نہیں ہے۔

حضرت مولانا مظفر بلخی نے بھی، جن کا سنہ ۷۴۰ھ میں مخدوم کی خدمت میں حاضر ہونا قرین قیاس ہے، یقیناً اپنے دست خاص سے ان مکتوبات کی نقل تیار کی ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اس پر ان کا اپنا پیش لفظ ہوگا۔ اتنا تو طے ہے کہ ان کے پاس مکتوبات کا ایک نسخہ تھا۔ چنانچہ مخدوم حسین بن معز بلخی نوشہ توحید کے مکتوبات میں اس جانب اس طرح اشارہ ملتا ہے کہ حضرت مولانا مظفر بلخی نے دہلی میں اپنا نسخہ مکتوبات حضرت مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کو مطالعہ کے لیے دیا تھا اور جس کے مطالعہ کے بعد انہوں نے فرمایا تھا:

"خدمت شیخ مسلمانی مارا بر خاک زدہ و زنارہائے مارا پیدا کردہ ست۔"

⑦ "مظفر شمس بلخی ۸ ویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے، بہت دنوں تک مخدوم

شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے ساتھ رہے اور یہ ساتھ ان کی وفات ۷۸۲ھ تک نبھایا
۸۰۳ یا بروایت دیگر ۸۰۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔" (ص ۶)

(الف) حضرت مخدوم جہاں کے وصال کے زمانے میں یعنی ۷۸۲ھ میں مولانا مظفر بلخی عدن میں تھے اور وصال مخدوم کے بعد بہار تشریف آئے۔

(ب) مناقب الاصفیا، تاریخ سلسلہ فردوسیہ وغیرہ میں آپ کا سن وصال ۷۸۸ھ ہی ہے۔ ۸۰۳ھ حسن عسکری صاحب نے لکھا ہے۔ پروفیسر عسکری صاحب نے اسکے علاوہ بھی لکھا ہے[1]

⑧ "ان حواشی میں منقول اشعار کو بھی الگ سے یکجا کرنے کی ایک سعی کی گئی، مگر اس کی بھی تکمیل نہیں ہو پائی۔ تاہم جتنا ہے اس سے لطف اٹھایئے اور باقی کے لیے حواشی کی اصل تو ہے ہی" (ص ۶)

حواشی کی نقل نامکمل، حواشی میں موجود اشعار کو یکجا کرنے کی سعی نامکمل۔ پتہ نہیں مکمل کیا ہے۔ چونکہ یہ کام سنجیدگی کے ساتھ نہیں کیا گیا اس لیے سنجیدگی کی تلاش اور سنجیدگی سے اس کا مطالعہ بھی ناممکن ہے ہاں لطف اٹھانے کی اجازت درست ہے۔

⑨ "اختلاف نسخ اور مسامحات کتابت میں متعدد جگہ پر جہاں ناگزیر تھا۔ بعض نکات ہر دو جگہ لکھ دیے گئے ہیں تاکہ قاری کو آسانی ہو.... اس مخطوطے اور مطبوعہ نسخے میں جو اختلاف ہے وہ بھی دے دیے جائیں۔" (ص ۷)

(الف) زیر تبصرہ ایڈیشن میں ص ۷۰ سے ص ۸۰ تک اختلاف نسخ کے عنوان سے اختلافات درج کیے گئے ہیں۔ اختلاف نسخ کے عنوان کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

[1] دیکھیے ISLAM & MUSLIMS IN MEDIVEL BIHAR PUBLISHED BY K.B.L. ص ۷۱۔

"خ = مخطوطہ مکتوبات صدی HL ۱۳۹۲ ط = مطبوعات مکتوبات صدی HL4997"

(الف) ع ر ب کی اطلاع کے مطابق موازنے کا کام عکسی ایڈیشن والے مخطوطے سے مطبوعہ نسخے کے مابین ہوا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ بجائے سن طبع اور مطبع کا ذکر کرنے کے HL نمبر لکھا گیا جب ہم اختلاف نسخ کا محولہ صفحات پر جائزہ لیتے ہیں تو زبان منھ کو آتی ہے۔ مثلاً یہ اطلاع دی جا رہی ہے کہ:

"۶/۱۳ خ: بیت ندارد"

یعنی ورق ۶ کی ۱۳ ویں سطر میں مخطوطہ میں بیت نہیں ہے جبکہ اس عکسی ایڈیشن میں ورق ۶ کی ۱۳ ویں سطر میں بیت موجود ہے۔

(ب) اختلاف نسخ کا ایک اور اندراج ملاحظہ ہو:

"۶/۱۷ خ، ط: دل بندہ"

جبکہ عکسی ایڈیشن میں "دل بیندہ" ہے۔

(ج) غرضکہ اختلاف نسخ نہایت گمراہ کن ہے اور بیحد افسوسناک ہے۔ نہ صرف مندرجات بالکل غلط ہیں بلکہ موازنہ کا کام کیا ہی نہیں گیا ہے، چنانچہ میں نے فی الحال مکتوب اول در توحید کا عکسی ایڈیشن اور مطبوعہ نسخوں کے درمیان موازنہ کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے لیکن اس سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ اب تک تین مکتوبات صدی کے تین مطبوعہ نسخے مجھے ملے۔

(۱) مطبوعہ مطبع علوی محمد علی بخش خاں نقشبندی، لکھنؤ سن طباعت ۱۲۸۶ھ۔

(۲) مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ جس کا تیسرا ایڈیشن (۱۹۱۱ء) میرے پیش نظر ہے۔

(۳) مطبوعہ پاکستان باہتمام سید نعیم الدین ندوی۔ یہ ایڈیشن نولکشور کے مطبوعہ نسخے پر منحصر ہے اس لیے مذکورہ بالا دونوں مطبوعہ نسخوں کے ساتھ عکسی ایڈیشن کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔

اختلاف نسخ

مکتوب اول در توحید

ورق/سطر	عکسی ایڈیشن (ع)	مطبوعہ علوی لکھنؤ (ط ل)	مطبوعہ نولکشور (ط ن)
۶/۷	برادر شمس	برادرم شمس	برادر اغر شمس
۶/۷	اہل طریقت توحید را برچہار درجہ نہادہ اند	توحید را اہل طریقت بر	توحید نزد اہل طریق بر چہار درجہ است
۶/۱۰	فردا ہیچ	فردائے قیامت	،، (ع)
۶/۱۰	بزبان لاالہ الا اللہ بگوید	بزبان بگوید لاالہ الا اللہ	،، (ط ل)
۶/۱۳	بیت	،، (ع)	(بیت ندارد)
۶/۱۳	تو دیدہ بدست آر کہ ہر ذرہ خاک	رو دیدہ بدست آر کہ ہر ذرۂ خاک	،، (ع)
۶/۱۵	خلود در دوزخ	،، (ع)	خلود دوزخ
	(ع)	(ط ل)	(ط ن)
۶/۱۵	آن توحید	این توحید	ازین توحید
۶/۱۷	العجائز این	العجائز یعنی لازم گیرید دین زنان پیر را در حق آسانی وسہولت این	،، (ع)
۶/۱۷	درجہ سیوم	درجہ سوم	،، (ط ل)
۶/۱۷	دل بینندہ	دل بندہ	،، (ط ل)
۶ب/۱	ہمہ کار از	ہمہ کارہا	،، (ع)
۶ب/۲	دیگر را فعل	،، (ع)	،، دیگر را از فعل
۶ب/۳	بردل	(ع)	بدل

ورق/سطر	عکسی ایڈیشن (ع)	مطبوعہ علوی لکھنؤ (ط ل)	مطبوعہ نولکشور (ط ن)
۶ب/۳	نوراست	نوریست	،، (ط ل)
۶ب/۵	بدان دارد	بران دارد	،، (ع)
۶ب/۶	آن تقلید	این تقلید	،، (ط ل)
۶ب/۷	شنیدہ باشد	،، (ع)	شنیدہ بود
۶ب/۸	سرا می بیند	،، (ع)	سرای می بیند
۶ب/۹	آن مقدار	این مقدار	،، (ط ل)
۶ب/۱۱	عارفست	عارفانست	،، (ع)
۶ب/۱۱	کہ در درجہ سیوم گفتیم	کہ در درجہ سوم گفتم	کہ درجہ سوم گفتیم
۶ب/۱۲	خالق را می داند	وخالق را بیند ومیداند	وخالق رامی داند
۶ب/۱۴	از نور ظہور	،، (ع)	نور باطن ظہور
۶ب/۱۵	برمثل	،، (ع)	برمثال
۶ب/۱۷	ازانک ذرہ نیست شد بل ازانکہ	نیست شد ونہ ازانکہ ذرہ آفتاب شد بلکہ ازانکہ	آن ذرہ نیست شدہ بلکہ
۷/۱	تعالے اللہ علواً کبیرا	تعالی اللہ عن ذٰلک علواً کبیر	،، (ط ل)
۷/۳	نظم	مثنوی	،، (ع)
۷/۴	پیش توحید او نہ کہنہ ونوست	پیش توحید او نہ کہنہ نہ نو است	پیش توحید تو نہ کہنہ است نہ نو ست
۷/۵	کی بود ما زما	،، (ع)	کی بود تو زما
۷/۵	تو ومن رفتہ	،، (ع)	من وتو رفتہ
۷/۶	چون آئینہ نکری آئینہ نہ	در آئینہ نکری آئینہ ما	،، (ط ل)

۷/۸ دیدن	" (ع)	درین
۷/۸ مقدودات	" (ع)	مقدورست
۷/۹ گویند	خوانند	" (طل)
۷/۹ مثنوی	بیت	؎
۷/۱۱ بسیار	" (ع)	پس بسیار
۷/۱۲ دیده فراز	دیده شده فراز	دیده شده از فراز
۷/۱۳ شربت قہر	شربت از قہر	" (ع)
۷/۱۴ آں حکایت	ایں حکایت	" (ع)
۷/۱۶ خویش بر	خویش را بر	" (ع)
۷/۱۷ ضَیَعۡتَ	" (ع)	صنعت
۷ب/۱ درآبادان کردن باطن عمر ضایع کردی پس بتوحید	عمر درآبادان کردن باطن ضایع کردی پس در توحید	عمر در آبادان کردن باطن ضایع کردی پس در توحید۔
۷ب/۲ رذندگان	کہ رذندگان	" (ع)
۷ب/۲ درین مقام	" (ع)	برین مقام
۷ب/۵ مستغرق بود	" (ع)	مستغرق باشد
۷ب/۸ صدمت	صدمہ	" (طل)
۷ب/۹ ھم	ہمہ	" (طل)
۷ب/۱۲ مثنوی	بیت	؎
۷ب/۱۳ تو دردگم شوکہ توحید	" (ع)	تو دردگم کہ توحید

۷ب/۱۴ ازینجاست......گم کند[1]	(ندارد)	(ندارد)
۷ب/۱۵ نہ اسم است اینجا نہ رسم	نہ اینجا اسم است و نہ رسم	" (ع)
۸/۲ اینجا نشان	" (ع)	ورائے اینجا نشان
۸/۴،۵ نیست و مثال آں	" (ع)	نیست و درمیان آئینہ وصورت نہ اتحاد بود نہ حلول تصور آن در مثال نہ حلول بود نہ اتحاد و مثال آں
۸/۷ سیوم	سوم	" (طل)
۸/۹ بدین	" (ع)	برین
۸/۹ مطلقاً ولیکن تفاوت درجات معلوم ہمہ است ہمچنین نام توحید بدین مجموع فقد	(نشان زد عبارت ندارد)	" (ع)
۸/۱۱ فواید	" (ع)	قواعد
۸/۱۲ وبحقیقت	وبہ تحقیق	" (ع)
۸/۱۴ علیہم	علیہم اجمعین	" (طل)
۸ب/۱ درآفت مبین	درآئی مبین	" (طل)
۸ب/۲ عابدان بودند از آب	" (ع)	عابدان بباد بی نیازی داند

[1] یہ عبارت مثنوی سے پہلے گیارہویں و بارہویں سطر میں موجود ہے اور اسی طرح دونوں مطبوعہ نسخے بھی ہیں لیکن عکسی ایڈیشن والے نسخے میں یہ عبارت مکرر لکھا گئی ہے۔

		همه هبا منثورا شده و این بین
		که از آب
۸ب/۴ خلیل اللہی	" (ع)	خلیل اللہ علی نبینا و علیہم السلام می
۸ب/۴ می سازند	می سازد	" (طل)
۸ب/۶ میکنند	میکند	" (طل)
۸ب/۷ روزی	" (ع)	(روزی) ندارد
۸ب/۱۰ رسید	" (ع)	رسد
۸ب/۱۰ لکام	" (ع)	لنبان
۸ب/۱۲ نهاده اورا		نهاده این مرد بدخاست
		قصه پرسید ایشان اورا
۹/۱ والسلام	" (ع)	(والسلام) ندارد

مکتوب اول کے متن کا موازنہ ملاحظہ کرنے کے بعد زیر تبصرہ ایڈیشن میں دیے گئے اختلاف نسخ کی حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

(۱۰) حواشی میں جو اقتباسات بغیر ماخذ کی وضاحت کیے نقل ہوئے ہیں، ان کی تلاش و جستجو پر بھی کوئی محنت نہیں کی گئی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ق ۹۱، ق ۱۷۵، ق ۱۰۱ ب بعد جو عربی اقتباسات بغیر کسی حوالے کے نقل کیے گئے ہیں وہ ارشاد المریدین مصنفہ شیخ الشیوخ عمر بن محمد شہاب الدین السہروردی (م ۶۳۲ھ) سے منقول ہیں، اس کا عربی مخطوطہ خدا بخش میں موجود ہے

(۱۱) **یہ مکتوبات کس سن میں لکھے؟** مکتوبات صدی کی جملہ طباعت جس میں متن بھی شامل ہے اور ترجمہ بھی حضرت زین بدر عربی کے پیش لفظ میں سن تالیف کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

"و با وقات مختلف از خطۂ بہار صانہا اللہ تعالیٰ عن الآفات و عن البوار در شہور سنۃ سبع و اربعین و سبعمائۃ در قصبۂ مذکور بہ سائل مذکور فرستادن فرمود"[۱]

"اور مختلف اوقات میں خطۂ بہار سے اللہ تعالیٰ اس کو آفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ رکھے ۷۴۷ھ میں سائل مذکور کو ارسال فرمایا"[۲]

لیکن کتب خانہ ریاست کپورتھلہ میں موجود مکتوبات صدی کا ایک نادر نسخہ مذکورہ سن تالیف ۷۴۷ھ پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے کیونکہ اس نسخہ موصوفہ میں خود مکتوب الیہ حضرت قاضی شمس الدین کا پیش لفظ موجود ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ میرے شیخ نے مجھے یہ خطوط ۷۴۹ھ کے مہینوں میں لکھے۔ حیدرآباد کی معروف اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری میں موجود مکتوبات صدی کے دو خطی نسخے بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ان دونوں نسخوں میں حضرت زین بدر عربی کا ہی پیش لفظ ہے لیکن بجائے "سبع و اربعین و سبعمائۃ" کے "تسع و اربعین و سبعمائۃ" ملتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ "تسع" سے سہو کتابت کی وجہ سے "سبع" بن گیا ہو، کاش زیر تبصرہ عکسی ایڈیشن مکمل دریافت ہوا ہوتا تو ہمیں زین بدر عربی کی وہ عبارت بھی مل جاتی جس میں سن تالیف آیا ہے اور یقیناً وہ کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے میں مددگار ہوتی۔

(۱۲) **مکتوبات صدی کا تحقیقی متن اور مکتوبات دو صدی** مکتوبات صدی کے متن کی تحقیق کے سلسلے میں مکتوبات دو صدی کے متن کو بھی پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ مکتوبات دو صدی میں قاضی شمس الدین (مکتوب الیہ مکتوبات صدی) کے نام بھی کئی مکتوبات ملتے ہیں۔ جن میں سے بعض مکتوبات صدی میں شامل بھی ہیں۔

---

۱ مکتوبات صدی، مطبوعہ مطبع علوی، لکھنؤ ص ۳ ۲ مکتوبات صدی، مترجمہ حضرت شاہ نجم الدین فردوسی و حضرت شاہ الیاس یاس بہاری، ص ۳۵۔

وارستہ سیالکوٹی کے دو رسالے

جواب شافی و احقاق حق

از

ڈاکٹر سید حسن عباس

"مصطلحات[1] شعراء" کا مصنف وارستہ مل سیالکوٹی (م ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء) کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مصطلحات کی ... سے اس کا شمار فارسی کے ہندوستانی علماء میں ہوتا ہے۔ وارستہ شاعر، ادیب، انشاپرداز اور نقاد کی حیثیت سے مشہور رہے۔ وہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی (م ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء) کا شاگرد تھا اور شیخ علی حزیں، خان آرزو، حاکم لاہوری، میر غلام علی آزاد بلگرامی اور واقف بٹالوی کا معاصر۔ اس کی تصنیفات میں مصطلحات شعرا، صفات کائنات، رسالہ جواب شافی و رسالہ احقاق حق کے علاوہ گلدستہ برجستہ[2]

[1] مصطلحات کے سال تالیف کے سلسلے میں مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم نے مکاتیب غالب میں لکھا ہے: اس کا سال تالیف ۱۱۴۹ھ ہے اور مصطلحات شعراء اس کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۴۹ھ برآمد ہوتا ہے، مصطلحات الشعراء مشہور ہو جانے کی وجہ سے (ال) کے ۳۱ عدد زیادہ جوڑ لیے جاتے ہیں جس سے ۱۱۸۰ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو مکاتیب غالب ص ۱۶۳ (حواشی) تیسرا ایڈیشن ناظم برقی پریس رامپور۔ ۱۹۴۵ء [2] اس کا مخطوطہ کتب خانہ مرکزی دانشگاہ تہران میں گلدستہ برجستہ یا جنگ رنگا رنگ کے نام سے موجود ہے جو شاید بخط وارستہ ہے۔

ف

کے نام سے اس کی بیاض کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مصطلحات اور صفات کائنات شایع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے جو ہندوستان کیا برصغیر کے سب سے بڑے فرہنگ شناس کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں اور فارسی فرہنگوں پر کافی کام کر چکے ہیں، غالب نامہ سلور جوبلی نمبر ۱۹۹۵ء میں مصطلحات شعراء پر نہایت مفصل مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ ان سے قبل ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے اپنی کتاب 'ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ' میں اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا، یہ دونوں مقالے مصطلحات کی ادبی اور لسانی اہمیت سمجھنے میں بے حد مفید ہو سکتے ہیں۔

جواب شافی اور احقاق حق: یہ دو رسالے بھی وارستہ کی تصنیفات میں شامل ہیں لیکن ابھی تک ان پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی جا سکی تھی اور اس کی بنیادی وجہ مذکورہ دونوں رسالوں کے قلمی نسخوں کی کمیابی ہے۔ یہاں ان دونوں رسالوں کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

جواب شافی: (سال تالیف ۱۱۶۳ھ) وارستہ نے یہ رسالہ حاکم لاہوری مصنف تذکرہ مردم دیدہ کے دیوان پر سراج الدین علی خان آرزو اکبر آبادی کے اعتراضات کے جواب میں لکھا۔ لکھتا ہے:

"... مخفی نماند کہ در شہور سنۂ ہزار و صد و شصت و سہ ہجری خان سخنداں، حکیم بیگ خان حاکم تخلص از دہلی بہ لاہور نزول فرمود بندہ وارستہ، بہ حکم محبت ہای دیرین، دیدن خان، سری کشیدم واز دیوانش چشمی آب دادم۔ دیدم بر حواشی صفحات، ایرادہای وارد و غیر وارد مرقوم است، و بر اکثر ابیات کہ از ادعمت منقصت خط آزادی دارد، خط بیزاری کشیدہ اند و قطع نظر از جہات دیگر،

از ہر دری کہ در آمدہ اند، راہ در آمد ندارد و از ہر بابی کہ ابواب کردہ اند،
در سخن گرفتہ است ... بعد استفسار معلوم شد کہ چراغ این اعتراضات بر
کردۂ شعلۂ ادراکِ خانِ دقیقہ یاب، تحقیق مآب سراج الدین علی خان
آرزو است۔"

وارستہ نے اس رسالے میں خان آرزو کے اعتراضات کا مدلل جواب دینے اور شعرائے فارسی کے اشعار سے شواہد پیش کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ رسالے کے آخر میں خان آرزو کے منیر لاہوری کے اشعار پر اعتراضات کے جواب بھی وارستہ نے دیے ہیں۔ سب سے پہلے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ ص ۳۶۲ پر وارستہ کے رسالے جواب شافی کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"حاکم لاہوری دیوان خود را نزد خان آرزو فرستاد و خواہش نمودہ کہ از حسن و قبح آن آگاہ سازد خان آرزو ہر چہ بخاطرش رسید، در حواشی دیوان حاکم لاہوری یادداشت کرد چون وارستہ مل سیالکوٹی اعتراضات خان آرزو را دید، در جواب آن رسالہ ای بہ نام "جواب شافی" نوشت۔"

آزاد نے اس کے بعد خان آرزو کے اعتراضات اور وارستہ کے جوابات سے کچھ نمونے نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ وارستہ نے خان آرزو کے بعض جوابات خوب دیے ہیں۔

جواب شافی سے کچھ اقتباسات لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے بھی اپنے تذکرہ گل رعنا[1] میں درج کیے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

[1] گل رعنا: ص ۱۶۳-۱۶۹ و تین تذکرے (گل رعنا) ص ۳۳۷-۳۴۲۔

حاکم: سر بہ زانو در پی فکر سخن باید شدن
شاہد معنی درین آئینہ شاید رو دہد

می فرمایند: "در آئینہ رو دادن نیست، رو نمودن است۔" رو دادن بہ معنی توجہ کردن و حاصل شدن آمدہ آخوند سعید اشرف بہ ہر دو معنی بستہ است:

رو بہ ما بی چارگان کی آن پری رو می دہد
چون ببیند بوالہوس را خنده اش رو می دہد

در بیت مذکور نیز یکی از این دو معنی مقصود شاعر است، و رو دادن اسمٰعیل ایہام دارد، بیت:

اطوار زشت ہرگز مقبول طبع ما نیست
آئینۂ دل ما کی رو دہد دورو را

امتیاز خان خالص ہم گوید، بیت:

پاک طینت را چہ باک از خوب و زشت عالم است
می کنم آئینہ خود را ہر چہ خواہد رو دہد

رسالہ جواب شافی کے قلمی نسخے کمیاب ہیں۔ ایک قلمی نسخہ پشاور میں مولانا اسرائیل[1] کے ذخیرۂ کتب میں تھا جس کے بارے میں معلوم کرنے سے پتہ چلا کہ اب موجود نہیں ہے وہاں سے نہ جانے کہاں منتقل ہو گیا۔ رامپور صولت پبلک لائبریری[2]

[1] فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی، پاکستان ۱۳/ ۲۲۲۴-۲۲۲۵ ABID RAZA[2]
BEDAR: CATALOGUE OF PERSIAN AND ARABIC MSS.
OF SAULAT PUBLIC LIBRARY RAMPUR P. 66.

میں موجود ایک مجموعہ میں وارستہ کے دونوں رسالے جواب شافی اور احقاق حق موجود ہیں۔ ایک اور ناقص نسخہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی میں محاکمہ کے عنوان سے موجود ہے، ان دونوں نسخوں کی مدد سے راقم السطور نے اس کا متن، تصحیح و حواشی کے ساتھ تیار کر لیا ہے۔

رسالہ احقاق حق : وارستہ نے یہ رسالہ شیخ علی حزیں پر خان آرزو کے اعتراضات بہ نام "تنبیہ الغافلین"[۱] کے جواب میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

" بعد حمد خدایی کہ علام غیوب است وستار عیوب، بر رای صدق گرای ارباب دانش و انصاف کہ غبار جور و اعتساف بر دامن شان ننشستہ مکشوف باد کہ خان سراج المحققین زاد تحقیقہ بر اکثر اشعار شیخ دقت آئین، تفرد گزین، شیخ محمد علی حزین ایراد ہا گرفتہ، رسالہ مسمیٰ بہ تنبیہ الغافلین ترتیب دادہ، چون بندہ وارستہ رسالۂ مذکور را بہ نظر امعان دیدم و بہ کنہ آن وارسیدم، دریافتم کہ بیشتر ناشی از تعصب بی جا است، در ملت سخن شناسی، احقاق حق واجب دانستہ، این چند ورق بہ قلم آوردم و احقاق حق نام گذاشتم "

وارستہ نے رسالے کی ترتیب یوں رکھی ہے۔ پہلے قولہ کے تحت شیخ حزیں کا شعر لکھتا ہے پھر خان آرزو کے اعتراض/اعتراضات 'قال' کے عنوان سے درج کرتا ہے، اس کے بعد اقول کے ذیل میں اپنے جواب/جوابات لکھتا ہے اور اپنی بات

---

[۱] یہ رسالہ ڈاکٹر محمد اکرم اکرام کی تصحیح کے ساتھ دانشگاہ پنجاب لاہور، پاکستان سے ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء میں شایع ہو چکا ہے۔

کی شہادت کے لیے فارسی کے معروف شعرا کے اشعار پیش کرتا ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو :

" قولہ [شیخ حزیں] : شیرین لبان چو بزم می لالہ گون کنند
خون مرا بہ جرعہ برای شگون کنند

قال [خان آرزو] : می بہ ساغر و شیشہ کردن مسموع است و جرعہ کردن شنیدہ نشدہ در صراح است جرعہ یک آب آشام

اقول [وارستہ] : جرعہ بہ معنی پیالہ در اشعار فصحا واقع است، اصطلاحاً و لامناقشۃ فی الاصطلاح چنان کہ حیاتی گیلانی گوید، بیت :

رحیق ناب چہ پرسی چہ کیفیت دارد — یکی بہ جرعہ فروریز خون ناب مرا

عرفی شیرازی ہم گوید، بیت : این جرعہ بنوش ای دل شوریدہ درین بزم
کین جام نہ خمخانۂ جمشید نیابی

رضی ارتیمانی ہم دارد، بیت :

بی می خرابیم و بی جرعہ مدہوش — زآن لعل میگون ز آن چشم جادو

سنجر کاشی گوید، بیت :

نرفت از خط بغداد بیشتر منصور — فقیر بود کہ این جرعہ را تمام کشید

دیگران ہم دارند، اما ایراد آن موجب اطناب است۔"

رسالہ احقاق حق کے بھی ابتک دو مخطوطے معلوم ہو سکے ہیں اور دونوں رامپور میں ہیں۔ ایک صولت پبلک لائبریری میں اور دوسرا رضا لائبریری میں۔ ان دونوں نسخوں کی مدد سے راقم السطور نے اس رسالے کا متن بھی تیار کر لیا ہے اور عنقریب دونوں رسالے یکجا شایع کرنے کا خیال ہے۔

برصغیر میں فارسی تنقید نگاری اور خاص کر اشعار کی تنقید کے سلسلے میں یہ دونوں رسالے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں الفاظ، اصطلاحات اور اضافات وغیرہ کی بڑی اچھی بحثیں مثالوں کے ذریعے پیش کی گئی ہیں۔ ان رسالوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وارستہ کس پایہ کا ادیب، دانشا پرداز اور نقاد تھا۔

لفظ "کہف" کا ہندوستانی ماخذ

از جناب گوردیال سنگھ مجذوب، نئی دہلی

ہندوستانی زبان و ثقافت کی قدامت مسلم ہے، گو اب انگریزی زبان کے عام استیلا و تسلط کی وجہ سے ہندوستانی زبان میں کئی اغریقی GREEK یا بازنطینی BY-ZANTINE الفاظ رائج ہوگئے ہیں تاہم عالمی سطح پر یوروپی زبان و ثقافت میں قدیم سنسکرت زبان کے متعدد الفاظ داخل ہیں جیسے SAINT جس کی اصل سنت ہے یا DENT جس کی اصل دانت ہے۔ دیو یعنی آسمانی صفت کے لیے DIVINE یا THEO استعمال ہوتا ہے، تلاش کرنے سے اس کی بہت سی مثالیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔

افسوس کہ اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی کے ماہرین لسانیات بھی اسی مرعوبیت کے نتیجے میں ان زبانوں کے الفاظ کا ماخذ یونانی زبان ہی بتایا کرتے ہیں۔

راقم نے اپنی ایک تحریر میں جو ۲۵ اپریل ۱۹۹۷ء کے روزنامہ پرتاب دہلی میں شایع ہوئی ہے۔ یہ ثابت کیا ہے کہ انگریزی لفظ THUNDER کا جس کے معنی آسمانی بجلی یا گرج ہیں ماخذ یونانی نہیں بلکہ فارسی زبان کا لفظ "تندر" ہے۔ جریدہ محولہ بالا کے ۲۸ اپریل ۹۷ء کے شمارے میں جناب غفران احمد صاحب نے قرآنی لفظ "کہف" کو بھی ہندی الاصل بتایا ہے، اس کی اصل ہیئت لفظ "کھوہ" ہے۔

یہ امر قدرے زیادہ وضاحت کا متقاضی ہے، ایک ہزار چار سو برس قبل جبکہ دنیا مذہب اسلام سے واقف بھی نہیں تھی اہل عرب "کہف" کا لفظ استعمال کرنے لگے تھے، جو ہندوستانی لفظ "کھوہ" سے لیا گیا ہے، راقم جناب غفران احمد صاحب کے تجزیے

کی صرف تائید ہی نہیں کرتا بلکہ "کھوہ" سے "کہف" بننے تک اسے لغت و لہجہ کی جس تبدیلی کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کی وضاحت بھی کر رہا ہے تاکہ معلوم ہوسکے کہ ہندوستان سے لمبا سفر طے کرکے عربی زبان میں یہ دخیل لفظ رواج پا چکا تھا۔

سب سے پہلے یہ بنیادی بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اصل عرب حرف "واؤ" کو حرف "ف" میں تبدیل کر دیتے ہیں، اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

لفظ لارڈ ویول LORD WAVEL کو عربی میں "ویول" کی بجائے "ویفل" لکھا جاتا ہے۔

لفظ SHIVA جو ہندوستانی عقیدہ کے مطابق برگزیدہ اور قابل احترام معبود کا نام ہے، اسے عربی میں "شیفا" لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح لفظ "مہادیو" کو جب عربی زبان میں لکھا جائے گا تو "واؤ" کو "ف" میں تبدیل کرتے ہوئے "مہادیف" لکھا جائے گا۔ اس کے لیے راقم کی کتاب "تناغم المآسی" ملاحظہ کی جائے۔

علی ہذا القیاس "کہف" کو جس کے معنی غار کے ہیں، ہندوستانی زبان کے لفظ "کھوہ" سے اپناتے وقت حسب ذیل تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں:

(الف) لفظ "کھوہ" میں اہل عرب نے آخری حرف "ہا" کو غیر ضروری یا زائد خیال کرکے حذف کر دیا کیونکہ انھوں نے اسے "ہا" ساکت کا درجہ عطا کیا۔

(ب) "کھوہ" کا لفظ چار حرفی (ک + ھ + و + ہ) تھا، اس کا آخری حرف "ہا" گرا دینے سے وہ محض تین حرفی "کھو" رہ گیا۔

(ج) پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عرب "واؤ" کو "ف" میں بدل دیتے ہیں، اس قاعدے کے بموجب انھوں نے "کھو" (ک + ھ + و) کے واو کو بھی ف سے بدل کر کہف (ک + ہ + ف) بنا لیا۔ میرے نزدیک جناب غفران احمد کی یہ لسانی و لغوی تحقیق قابل ستایش ہے۔

استفسار و جواب

دارالمصنفین کی بنیاد کس نے ڈالی تھی؟

ڈاکٹر ابرار اعظمی، سابق صدر شعبہ تربیت اساتذہ پوسٹ گریجویٹ کالج۔ مالتاڑی۔ اعظم گڈھ } محکمہ اطلاعات اترپردیش کی شایع کردہ کتاب "اودھ آئینہ ایام میں" پیش نظر ہے، اس میں مولوی ندرالحفیظ ندوی نے تحریر کیا ہے کہ "ندوی فرزندوں نے میر کارواں حضرت سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی"۔ دارالمصنفین کی نظریاتی اور عملی تاسیس مولانا شبلی نعمانی کی فکر و عمل کی رہین منت ہے۔ براہ کرم دستاویزی شواہد کی روشنی میں حقیقت حال سے مطلع فرمائیں!

معارف: دارالمصنفین علامہ شبلی کے ذہن کی پیداوار ہے، وہی اس کے موسس اور اصل بانی تھے، دستاویزی شواہد کے لیے حیات شبلی مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی ملاحظہ کیجئے یہاں اسی کا ملخص پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا مرحوم کے ذہن میں دارالمصنفین کی تجویز کتب خانہ ندوۃ العلماء کی عمارت کے سلسلہ میں سب سے پہلی بار آئی، مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جو سالانہ رپورٹ انہوں نے لکھ کر پیش کی تھی اس میں اس کا ذکر کیا تھا اور اسی جلسے میں پڑھنے کے لیے "ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت" کا عنوان میرے (سید صاحب کے) حوالہ فرمایا تھا اور ارشاد ہوا تھا کہ اسی سلسلہ میں ایک دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کرو۔

اگست ۱۹۱۰ء میں نواب مزمل اللہ خاں نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا شبلی کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوانا چاہا تو مولانا نے اس کے بجائے اس کی خواہش کی کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو اور اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر قائم ہو اور نواب صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں بشرطیکہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں۔

جولائی ۱۹۱۳ء میں جب ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہوئے تو اُدھر سے یکسو ہوکر ان کے ذہن میں ایک تصنیفی ادارہ کا خیال زور پکڑنے لگا، ۱۹۱۴ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ اس تجویز کو عام طور پر پورے ملک کے سامنے پیش کیا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا اور مخصوص احباب کو خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی، عرصہ تک وہ اس بارے میں متردد رہے کہ دارالمصنفین کا مرکز کہاں ہو جس کا قطعی فیصلہ خود قاضی تقدیر نے کر دیا کہ اگست ۱۹۱۳ء میں مولانا کو اپنے عزیز بھائی مولوی محمد اسحٰق صاحب کی موت نے اعظم گڈھ آنے پر مجبور کیا، یہاں سکون و اطمینان نظر آیا تو اسی شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا، یہاں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالنی چاہی تو سب سے پہلے مولانا نے اس کے لیے اپنے ذاتی باغ اور بنگلہ کو وقف کرنا چاہا، خاندان کے اور شرکا کی رضامندی حاصل کرکے وقف نامہ لکھوانا چاہا، ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو سید صاحب کو لکھا "کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہوگئی ہیں، چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں، وقف نامہ باغ زیر تحریر ہے۔ بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دارالضیوف بن گیا ہے"۔ درجہ تکمیل کے وظائف کے لیے مولانا حمید الدین صاحب نے ۳۰ روپے ماہوار مقرر کیے، کتب خانہ، باغ اور

بنگلہ کی وسعت و ترمیم میں جو مصارف کثیر پڑنے والے تھے ان کا بار بھی مولانا نے خود اپنے سر لیا، دار التصنیف اور دار التکمیل کے طلبہ کے قیام کے لیے اپنے والد مرحوم کا مکان جو بنگلہ کے قریب اور دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا کرایہ پر لیا، باغ کے پہلو میں سڑک پر جو سرکاری مکان تھا اس کے خریدنے کا بھی سامان کرنا چاہا۔

ان تمام مراتب کے طے ہو جانے کے بعد طلبائے دار المصنفین کے لیے قواعدِ داخلہ بنائے جو انہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور حیات شبلی صفحہ ۶۹۹-۶۹۸ پر درج ہیں۔

ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد ندوہ کے فارغ التحصیل و قریب فارغ التحصیل طلبہ میں سے جن سے مولانا شبلی خود واقف تھے چند طلبہ کا انتخاب کیا، مولوی ابو الحسنات عبد الشکور ندوی مرحوم سابق رفیق دار المصنفین کا انتخاب خود مولانا ہی نے فرمایا تھا، مولانا خلیل عرب، مولانا عبد الرحمن نگرامی اور مولوی محسن بہاری پر بھی ان کی نگاہِ انتخاب پڑی۔ ندوہ کے متعدد طلبہ نے داخلہ کی خواہش کی تھی، ان کو بقر عید بعد انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ ۲ نومبر ۱۹۱۴ء تک مولانا اس قابل ہو گئے تھے کہ دو تین ماہ بعد اپنے بعض احباب خاص[1] کو دار المصنفین دیکھنے کے لیے مدعو کر سکیں۔ (ماخوذ از حیات شبلی ص ۶۹۰)

مولانا سید سلیمان ندوی کی مذکورۂ بالا تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ دار المصنفین کی داغ بیل خود مولانا شبلی ڈال چکے تھے۔ لیکن ان کی زندگی میں وہ بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا، حیات سلیمان کے مصنف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں "سید صاحب کے علمی کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ دار المصنفین کی تعمیر و ترقی ہے، اگرچہ اس کی بنیاد علامہ شبلی نے ڈالی تھی مگر ابھی وہ اس کے ابتدائی انتظامات سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کا وقت آخر ہو گیا۔" (حیات سلیمان ص ۹۵)

---

[1] نواب علی حسن خاں وغیرہ۔

البتہ دار المصنفین کے خاکے میں رنگ بھرنے اور اس کے باقاعدہ علمی جامہ پہننے کا کام ان کے بعد ہوا جب ان کی وصیت کے مطابق ان کے تلامذۂ خاص نے اسے تالیف و تصنیف اور اشاعت کا مرکز بنایا۔ حضرت سید صاحب رقمطراز ہیں تاہم مولانا نے دار المصنفین کے متعلق جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ "شاید وہی میرا مدفن بھی ہو" وہ پوری ہوئی، ان کی نیک نیتی سے ان کے بعد ہی دار المصنفین قائم ہوا۔" (حیات شبلی ص ۸)

علامہ شبلی کے بعد دار المصنفین کو کس کی رہنمائی میسر آئی اس کے متعلق بھی غلط بیانی کی گئی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں "مولانا مرحوم کی وفات کے تیسرے روز گویا ماتم سے فارغ ہو کر مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا کے ان چند شاگردوں کو جو اس وقت جمع تھے ایک مجلس اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ مولانا مرحوم کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی جائے، اس مجلس میں اس وقت مولانا حمید الدین صاحب کے علاوہ حسب ذیل اشخاص شریک تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی، مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی اور خاکسار۔" (حیات شبلی ص ۶۸۹)

گویا سید صاحب کے نزدیک مولانا حمید الدین صاحب نے علامہ شبلی کے بعد ان کے ناتمام کاموں کی تکمیل اور دار المصنفین کا نظام چلانے کے لیے مجلس اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی تھی، جن کو اپنے ایک مکتوب میں خود مولانا شبلی نے لکھا تھا "اور اگر دار المصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا؟" (حیات شبلی ص ۲۳)

یہاں اس کی صراحت بھی ضروری ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت دکن کالج پونا میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، ان کو اعظم گڑھ آنے میں وقت لگا، البتہ مولوی مسعود علی صاحب ندوی اس وقت یہیں مقیم تھے اور مولانا کے اعزہ اور مولانا حمید الدین فراہی کے

چھوٹے بھائی حاجی مولوی رشید الدین صاحب سے مل کر دارالمصنفین کے لیے ضروری کارروائی میں مصروف تھے۔

بعد میں اس مجلس اخوان الصفا میں مولانا عبدالسلام ندوی کے نام کا اضافہ ہوا جو اس وقت الہلال کی ادارت سے وابستہ تھے اور سیرت نبوی کی تالیف میں علامہ شبلی کے لٹریری اسسٹنٹ بھی رہ چکے تھے۔ (حیات شبلی ص۷۴۲)

مولانا سید سلیمان ندوی دارالمصنفین کی پہلی سالانہ روداد میں تحریر فرماتے ہیں:

"۲۱ نومبر کو واقعہ[1] کے تیسرے دن برادر اعظم مولانا حمید الدین صاحب کی دعوت پر ہم نے مولانائے مرحوم کے اعمال متروکہ کی تکمیل کے لیے اخوان الصفا کے نام سے ایک مجلس تاسیس کی۔ اس مجلس کے حسب ذیل ممبر تھے۔

۱۔ مولانا حمید الدین صاحب صدر ۲۔ سید سلیمان ندوی ناظم ۳۔ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی رکن ۴۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی رکن ۵۔ مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی رکن۔" (بحوالہ حیات سلیمان ص۹۶)

مجلس دارالمصنفین کے صدر مولانا حمید الدین صاحب نے بھوپال اور حیدرآباد کی ریاستوں سے سیرت اور دارالمصنفین کے اجرائے وظائف کے لیے بھی جدوجہد کی، مولانا سید سلیمان ندوی ارقام فرماتے ہیں:

"اور آخر ۲۹ نومبر ۱۹۱۴ء میں مولانا حمید الدین صاحب اور خاکسار سرکار عالیہ[2] کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بشارت کے ساتھ واپس آئے کہ سیرت کی ماہوار رقم بقیہ زمانہ مقررہ تک جاری رہے گی ... مولانا حمید الدین صاحب کی

[1] یعنی مولانا شبلی کا واقعۂ وفات جو ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیش آیا تھا [2] بھوپال۔

تحریک اور نواب عماد الملک بہادر اور مسٹر حیدری بی۔اے معتمد عدالت و امور عامہ سرکار نظام کی سفارش سے سرکار نظام خلد اللہ ملکہ نے اپنی مشہور خسروانہ فیاضی اور علم دوستی کے ساتھ مولانائے مرحوم کے منصب (۳۰۰) ماہوار کو دارالمصنفین میں منتقل کرنا منظور فرمایا۔" (حیات سلیمان ص۹۷)

۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو دارالمصنفین کا جو پہلا جلسہ ہوا اس میں جن اشخاص کو دارالمصنفین کا رکن اساسی منتخب کیا گیا ان میں پہلا نام مولانا حمید الدین صاحب صدر کا اور دوسرا مولانا سید سلیمان ندوی ناظم کا تھا (حیات سلیمان ص۱۰۱)

پتہ نہیں مقالہ نگار کو اس کی خبر ہے کہ نہیں کہ مجلس دارالمصنفین کا یہ سرپرست ندوۃ العلما کا رکن بھی تھا اور علامہ شبلی نے اس کو با اصرار اس کی تعطیلوں میں بلوا کر ندوہ میں رکھا اور چند طلبہ کو اس سے الدروس[1] الاولیہ فی العلوم الطبیعۃ کے کچھ اسباق پڑھوائے۔ (حیات شبلی ص۴۳۱)

۱۹۰۸ء میں جب مولانا حمید الدین صاحب مدرسۃ العلوم کراچی سے علی گڑھ کالج میں عربی لکچرر ہو کر آگئے تو مولانا شبلی نے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز منظور کرائی کہ ایک طالب علم کو ندوہ کے خرچ پر علی گڑھ کالج ان سے الدروس الاولیہ اور ہیئت جدیدہ پڑھنے کے لیے بھیجا جائے، اس تجویز پر عمل ہوا، مگر مولوی حمید الدین صاحب فوراً ہی علی گڑھ سے الہ آباد یونیورسٹی میں چلے آئے اس لیے تجویز کامیاب نہ ہوسکی (حیات شبلی ص۴۳۲)

مولانا شبلی نے اپنے بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب مصنف نظام القرآن کو لکھا کہ وہ اپنی تعطیل میں آکر مدرسہ[2] کے لڑکوں کو قرآن پڑھا دیں، چنانچہ وہ دو سال

[1] یہ جدید طبیعیات کی ایک کتاب تھی جو بیروت سے شایع ہوئی تھی [2] دارالعلوم ندوۃ العلماء مراد ہے۔

تک اپنی تعطیل میں آکر قرآن پاک کا درس دیتے رہے (حیات شبلی ص ۴۳۳)

زیر بحث مقالہ پہلے محکمہ اطلاعات اتر پردیش کے ماہنامہ نیا دور کے اودھ نمبر میں شایع ہوا تھا جسے پڑھ کر ایک صاحب علم و نظر محقق کو دار العلوم ندوہ کی زمین کے بارے میں استفسار کرنا پڑا تھا جس کا جواب فروری ۱۹۹۶ء میں دیا جا چکا ہے، معلوم ہوتا ہے اب محکمہ نے اسی نمبر کو کتابی صورت میں شایع کیا ہے، کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری تاہم دار المصنفین کے متعلق لکھنے میں اصل مراجع پیش نظر نہیں رکھے گئے ہیں، اسی لیے ہم کو اس قدر تفصیل سے لکھنا پڑا تاکہ زیر بحث مضمون سے پیدا ہونے والی غلط فہمی رفع ہوجائے اور دار المصنفین کی بنا و تاسیس اور تعمیر و ترقی میں جس کا جس قدر حصہ رہا ہے وہ اسے مل جائے' وَآتِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ ۔

سید الطائفہ حضرت سید صاحبؒ [illegible] کارنامے اور دار المصنفین پر ان کے احسانات مسلم ہیں، انکے کارنامے دار المصنفین کے چپہ چپہ پر ثبت ہیں' وہ اور دار المصنفین لازم ملزوم ہیں' وہی مولانا شبلی کے علمی وارث اور جانشین تھے، جن کی بدولت انکے ناتمام کام مکمل ہوئے، سیرۃ النبی کے بقیہ حصوں کی تکمیل کی سعادت انہیں میسر آئی، انہوں نے دار المصنفین کو مولانا شبلی کے تخیل سے زیادہ وسعت اور ترقی دیکر اسے بین الاقوامی ادارہ بنایا، انہی کی رہنمائی اور تربیت میں دار المصنفین کے رفقاء مصنفین نے جن میں اکثر ندوی اور بعض غیر ندوی فضلا بھی تھے، جنھوں نے محققانہ تصنیفات کا انبار لگا دیا۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کو اور ان کے زیر رہنمائی ندوی فرزندوں کو دار المصنفین کا بانی قرار دینا حقائق و واقعات کے خلاف ہے، سید صاحب کے سوانح نگار اور جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے بالکل بجا طور پر انہیں "معمار دار المصنفین" لکھا ہے (حیات سلیمان ص ۸۸ و ۸۵)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ندوی فرزندوں نے میر کارواں حضرت سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں دار المصنفین کو پروان چڑھایا اور بام عروج پر پہونچایا۔

"ض"

معارف کی ڈاک

مکتوب دہلی

ذاکر نگر۔ نئی دہلی

۳۰ اپریل ۱۹۹۷ء

محبی ضیاء الدین اصلاحی صاحب! سلام و رحمت

جنوری ۱۹۹۷ء کے معارف میں پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب کا خط چھپا تھا، جس میں موصوف نے لکھا ہے: "ضیاء صاحب نے انگریزی میں مولانا ابو الکلام آزاد کی جو سوانح لکھی ہے اور اس وقت زیر اشاعت ہے وہ مکمل نہیں ہے۔ بلکہ پہلی جلد ہے جو مولانا کی ۱۹۴۰ء تک کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری جلد لکھنے سے قبل افسوس ہے کہ ضیاء صاحب کی وفات ہوگئی"۔ اس مسئلے پر میرے اور شروانی صاحب کے خیالات میں کافی اختلاف ہے، جس سے معارف کے قارئین بخوبی واقف ہیں۔ ابھی حال میں مرحوم ضیاء صاحب کا ایک اہم خط دریافت ہوا ہے جو مرحوم کے قریبی عزیز ڈاکٹر سعید الوحید صاحب کے نام ہے جو ایک طویل عرصے تک سعودی عرب میں رہ چکے ہیں اور اب مستقل طور پر ذاکر نگر میں مقیم ہیں۔ اس خط پر ۲۵ فروری ۱۹۹۶ء کی تاریخ درج ہے۔ اس خط سے بہت سے اختلافی مسائل حل ہوجاتے ہیں، اس لیے اس کی ضروری تلخیص ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:

۲۵ فروری ۱۹۹۶ء

عزیز مکرم جناب سعید الوحیدی صاحب قبلہ،   سلام و تحیات

مولانا آزاد کے سیاسی سوانح حیات پر میری پہلی جلد ۱۹۰۳ء/۱۹۰۲ء - ۱۹۴۰ء مکمل ہوگئی ہے۔ کسی اچھے پبلیشر کی تلاش ہے۔ انشاء اللہ جلد مل جائے گا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی مکمل ہے۔ بیماری کے زمانے میں خاصا کام ہوا۔ دوسری جلد پر انشاء اللہ جلد کام شروع کروں گا جو ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۸ء کی مدت پر محیط ہوگا۔ اس زمانے کا MATERIAL بھی زیادہ ہے اور یہ غیر دریافت شدہ بھی ہے یعنی UNEXPLORED ہے۔ دعا کیجئے کہ خدا اتنی مہلت دے کہ اس کام کو مکمل کر جاؤں۔ انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔

آپ کا بھائی

ضیاء الحسن فاروقی

مکتوب اعظم گڑھ

اعظم گڑھ

۲۵ مارچ ۱۹۹۷ء

محترم مولانا ضیاء الدین صاحب   السلام علیکم

مارچ ۹۷ء کے معارف میں جناب توقیر احمد ندوی کا مضمون "ہندوستان میں عربی سیرت نگاری" شائع ہوا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "مولانا اسمٰعیل مدراسی مرحوم نے علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کے عربی ترجمہ کی ذمہ داری لی تھی مگر وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے"۔ تعجب ہے کہ اس پر آپ نے ادارتی نوٹ نہیں لگایا۔

سیرۃ النبی جلد اول مترجمہ مولانا اسمٰعیل ندوی مرحوم کا اصل مسودہ جامعہ اسلامیہ

مدینہ منورہ میں محفوظ ہے۔ جس کی ایک کاپی مولانا محمد اجمل اصلاحی سابق استاد جامعہ اسلامیہ نے جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب مرحوم کو ان کے سفر عمرہ کے موقع پر مدینہ منورہ میں دی تھی۔ مرحوم نے یہ مسودہ جنوری ۸۶ء میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے حوالہ کر دیا، اتفاق سے اس وقت ندوہ میں رابطہ ادب اسلامی کا سمینار ہو رہا تھا جس میں شرکت کے لیے عبد اللہ ابراہیم انصاری صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ موصوف نے اس کی علی الفور طباعت پر زور دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا محترم نے سیرت کا عربی مسودہ نظر ثانی کے لیے مولانا عبد اللہ عباس صاحب کے سپرد کیا ہے کیونکہ ان کے بقول اس پر حواشی کی ضرورت ہے۔ اس وقت سے اب تک محترم مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب متعدد بار فرما چکے ہیں کہ سیرۃ النبی جلد اول کا عربی ترجمہ جلد شائع ہو جائے گا۔ اسی طرح سیرت عائشہ مولفہ علامہ سید سلیمان ندوی، مترجمہ مولانا محمد ناظم ندوی صاحب (پاکستان) کا مسودہ بھی ۸۹ء میں ندوۃ العلماء بھیجا گیا تھا جس کے حوالوں کی مراجعت و تحقیق کا کام مولانا محمد عارف عمری صاحب رفیق دار المصنفین نے انجام دیا ہے۔ لیکن سیرۃ النبی ہی کی طرح اس کی اشاعت میں بھی نہ جانے کیوں تاخیر ہو رہی ہے

خاکسار دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے سالانہ جلسوں میں ان مسودوں کے متعلق استفساً بھی کرتا رہا ہے۔

مخلص

سلمان سلطان

(رکن مجلس انتظامیہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی)

وفیات

مولانا محمد منظور نعمانی

گزشتہ مہینے کا معارف اشاعت کے مرحلے میں تھا کہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ مولانا محمد منظور نعمانی ۴، ۵ مئی کی درمیانی شب میں انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

اس قحط الرجال میں مولانا جیسے حکمت دین سے واقف، صاحب فہم و بصیرت اور مدبر عالم، قوم کے دردمند مصلح اور ملت کے ہمدرد و غمگسار کا اٹھ جانا کس قدر المناک سانحہ ہے۔

مولانا ایک عالم و مصنف اور صاحب سلوک و عرفان بزرگ ہی نہ تھے بلکہ زمانے کے نبض شناس، وقت کے تقاضوں اور حالات سے باخبر اور عاقبت بین بھی تھے، جن کا عمل اس پر تھا کہ ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

وہ مذہبی، اصلاحی، قومی، ملی، تعلیمی اور اجتماعی جدوجہد کے ہر محاذ پر سرگرم اور متحرک دکھائی دیتے تھے، انہیں مسلمانوں کی موجودہ پستی و زبوں حالی کا پوری طرح احساس بھی تھا اور وہ اس کے ازالے کے لیے نہایت فکرمند بھی رہتے تھے، آزاد ہندوستان میں جن مسائل نے مسلمانان ہند کی زندگی تلخ اور مکدر کر رکھی ہے، ان پر شور و غوغا مچانے، لچھے دار باتیں اور دھواں دار تقریریں کرنے اور پرجوش تحریریں لکھنے والے تو بہت سارے لوگ ہیں لیکن ان پر مولانا کی طرح تڑپنے، بے چین ہو جانے، درد و کرب اور

خلش و اضطراب میں مبتلا ہونے والے بہت کم لوگ ہیں، وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے دعا و مناجات میں بھی مصروف رہتے تھے اور ملک کے گوشے گوشے کی خاک بھی چھانتے رہتے تھے، ان کے گریہ شب اور دعاہائے سحرگاہی سے گھبرا کر ابلیس بھی یہ کہتا رہا ہوگا کہ ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحرگاہی سے جو ظالم وضو

ایسے بیدار مغز و ہوشمند عالم کی وفات مسلمانوں کی بدنصیبی، قوم و ملت کا زیاں اور علم و دین کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی مراد آباد ضلع کے قصبہ سنبھل میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ یہیں اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، دارالعلوم مئو میں بھی درسیات کی تحصیل کی اور آخر کے دو سال دارالعلوم دیوبند میں گزارے۔ اس وقت مولانا انور شاہ کشمیری صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے، ان سے اور دوسرے اساتذۂ فن سے درس لیا، شاہ صاحب کے تلمذ پر ان کو ہمیشہ فخر رہا اور اپنے تمام اساتذہ میں ان ہی سے سب سے زیادہ محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ ان سے بیعت بھی ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت اس کے بعد ہوئے تھے۔

مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد چند برس تک بعض عربی مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دی، اس زمانے میں بعض داخلی و خارجی فتنوں کا بڑا زور تھا، ان فتنوں سے اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کی بیخ کنی اور شرک و بدعت کے فروغ کے علاوہ علمائے دیوبند کی ذات و مسلک بھی مجروح ہو رہا تھا، اس لیے مولانا طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کی سرکوبی کی تیاری کرنے لگے تھے اور اب تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی انکے خلاف محاذ آرائی میں حصہ لینا شروع کیا، چنانچہ ان کی ابتدائی زندگی بعض فرقوں کے

مقابلوں اور ان سے مناظروں کے لیے وقف رہی اور اس میں وہ بڑے کامیاب رہے۔

اسی سلسلے میں انہیں اپنے مخالفوں کے نظریات کے ابطال کے لیے ایک علمی و دینی ماہنامہ رسالہ نکالنے کا خیال بھی آیا جو محرم ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء سے اب تک ان کے انتقال کے بعد بھی الفرقان کے نام سے برابر شایع ہو رہا ہے اور وہ ملک کا مشہور علمی، دینی اور اصلاحی رسالہ خیال کیا جاتا ہے۔

مولانا کی یہ جرات و ہمت بھی قابل داد ہے کہ انہوں نے شروع میں رسالہ ایسی جگہ سے شایع کیا جو ان کے حریفوں کا خاص مرکز تھی۔ ان کی مہم جو اور حوصلہ پسند طبیعت کو ہمیشہ اپنی سرگرمی عمل کے لیے نئے میدانوں اور خوب سے خوب تر راہوں کی تلاش و جستجو رہتی تھی، عمر کی پختگی اور بعض تجربوں کے بعد جب وہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی دینی تحریک سے متوسل ہو گئے تو مسلمانوں کی اصلاح کے اس محدود تصور پر قانع نہیں رہ سکے جس کی بنا پر بعض طبقوں کی اعتقادی و عملی غلطیوں کی بحث و تمحیص اور ان کے افراط و تفریط کی تغلیط و تردید الفرقان کا خاص موضوع بن گیا تھا بلکہ یہی دینی دعوت ان کے دل و دماغ پر چھا گئی اور وہ ان کی زندگی اور ان کے اعمال کا خاص محور اور الفرقان کی اصل دعوت بن گئی۔

الفرقان کے متعدد خاص نمبر بھی شایع ہوئے جو بہت مقبول ہوئے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ پر اس کے خاص نمبر بڑی اہمیت و منفعت کے حامل ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں اور عظیم داعیوں کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں اور ان کی دعوت و تعلیم کو جس بہتر انداز میں ان میں پیش کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ اور صاحب الفرقان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کے

حج نمبر سے حاجیوں کو بڑا فائدہ پہونچا۔

تبلیغی و دعوتی اسفار اور الفرقان کی ادارت کے ساتھ ساتھ مولانا ہمیشہ تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہتے جس کا انہیں اچھا ذوق، خاص سلیقہ اور خداداد ملکہ تھا، وہ اردو کے بہت اچھے اہل قلم تھے۔ ان کی تحریریں نہایت سلیس، شگفتہ اور رواں ہوتی تھیں۔ جن کی زبان آسان اور بڑی عام فہم ہوتی اور پیش کرنے کا انداز اتنا موثر اور دل نشیں ہوتا تھا کہ عام آدمی کو بھی ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے اس پر ان کی مکمل گرفت ہوتی تھی اس لیے اپنے مدعا و مقصود کو کسی ایچ پیچ کے بغیر اچھی طرح واضح کر دیتے تھے۔

مولانا کی چھوٹی بڑی بے شمار تصنیفات ہیں اور وہ سب اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے درجنوں ایڈیشن بھی نکلے اور ملک کی مختلف زبانوں کے علاوہ انگریزی اور عربی وغیرہ میں ترجمے بھی ہوئے، ان کی جن کتابوں کا فیض بہت عام ہوا ان کا تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا۔

اسلام کیا ہے؟ یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے بعد کے خاص حالات میں لکھی گئی ہے، اس میں ایک عام مسلمان کے لیے مکمل دین کو آسان اور موثر دعوتی زبان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ رسالہ مسلمانوں کے لیے رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنے اور غیر مسلموں میں بھی اسلام کی اصل صورت واضح ہو جائے۔

دین و شریعت: اس کا موضوع بھی دعوتی ہے مگر یہ کسی قدر اونچی سطح کے لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے۔

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اس میں قرآن مجید کی عمومی دعوت کا خلاصہ

بڑے موثر اور دل نشین انداز اور آسان و عام فہم زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔

آپ حج کیسے کریں ؟ اس کو لکھنے کا دو خاص مقصد تھا، ایک تو یہ کہ معمولی خواندہ آدمی کو بھی حج کے مناسک و ارکان ادا کرنے میں سہولت ہو، دوسرا مقصد یہ تھا کہ حج کے اعمال کو ادا کرنے کے وقت جن دینی جذبات سے حاجی کو سرشار ہونا چاہیے ان کی تحریک کا سامان کیا جائے۔ ان مقاصد کے لحاظ سے یہ کتاب بہت کامیاب ہوئی۔

آسان حج : اس میں وہی مضمون مزید مختصر اور آسان کر کے لکھا گیا ہے، راقم کو حج بیت اللہ کے سلسلے میں مولانا کے ان رسالوں سے بڑا فائدہ پہونچا۔

کلمہ طیبہ کی حقیقت : اس میں کلمہ کی حقیقت و مفہوم بہت سادہ اور آسان زبان اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

نماز کی حقیقت : اس میں آسان زبان اور دل نشیں انداز میں نماز کی روح بتائی گئی ہے، یہ رسالہ بھی بہت نفع بخش ہے۔

معارف الحدیث : یہ مولانا کی سب سے اہم اور مفید کتاب ہے جو اردو کے علمی و حدیثی ذخیرہ میں ایک بہت قیمتی اضافہ ہے، اس کو بڑی شہرت و قبولیت نصیب ہوئی، اس کی سات جلدیں خود مولانا نے مرتب کر کے شایع کی ہیں۔ آٹھویں جلد ان کے برادرزادہ مولوی محمد زکریا استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مرتب کر رہے ہیں۔ یہ کتاب دور حاضر کے خاص حالات اور ایک عام پڑھے لکھے شخص کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے، یہ دراصل حدیث نبوی کے ضخیم دفتر سے ایک انتخاب ہے جو ترجمے کے ساتھ ایسی سادہ اور مختصر تشریح پر مبنی ہے جس سے حدیث کا اصل مغز و مدعا اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے اور یہ کتاب انسان کی علمی و روحانی ترقی و اصلاح کا ذریعہ بھی بن گئی ہے، گو اس میں

فنی مسائل اور مہمات امور سے براہ راست تعرض نہیں کیا گیا ہے، تاہم اس سے احادیث کی بہت سی علمی و فنی گرہیں صاف طور پر حل ہو گئی ہیں، حدیثوں کے فقہی پہلو اور فقہا کے اختلافات کا تذکرہ بقدر ضرورت اس طرح کیا گیا ہے کہ افتراق باہمی کے رجحان کی ہمت شکنی ہو۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اہل علم اور طلبہ حدیث کے لیے بھی بہت کارآمد ہے۔

ان کتابوں سے مسلمانوں کو بڑی رہنمائی اور تقویت ملی اور ان کی حیثیت دراصل صدقہ جاریہ کی ہے۔

مولانا کا شمار اس عہد کے ممتاز اور صف اول کے علماء میں ہوتا تھا، دینی علوم میں ان کو بڑا رسوخ اور پختگی حاصل تھی۔ تفسیر، فقہ، کلام اور کتب معقولات پر ان کی وسیع اور گہری نظر تھی لیکن حدیث سے ان کو زیادہ شغف اور مناسبت تھی جس کی تحصیل ہندوستان کے مشہور و نامور اور نابغہ روزگار محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے کی تھی اور کئی برس تک خود بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کتب حدیث کا درس دیا، ان کی کتاب معارف الحدیث بھی حدیث میں ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔

کم لوگوں کو تحریر و تقریر دونوں پر قدرت ہوتی ہے، مگر مولانا کو تقریر کی بھی اچھی مشق تھی، مناظروں میں ان کی کامیابی میں اس کو بھی بڑا دخل تھا، تبلیغی جماعت کے اجتماعات اور دوسری ملی و دینی تحریکوں میں بھی وہ اپنی تقریروں کی اثرانگیزی اور دل پذیری کی بنا پر مدعو کیے جاتے تھے، آخر میں وہ مختصر تقریریں کرنے کے عادی ہو گئے تھے، راقم کو ایک مرتبہ انجمن تعلیمات دین کے جلسہ میں ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا جو مختصر ہونے کے باوجود واضح، مدلل اور دل نشین تھی۔

مولانا قوم، ملک اور ملت کے مسائل سے کبھی بے تعلق اور بیگانہ نہیں رہے

تقسیم کے بعد مسلمانوں کو جس بحران اور پیچیدگی کا سامنا کرنا اور آئے دن جن نت نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا انکے حل کے لیے جو مخلصانہ کوششیں اور تدبیریں ہوئیں، ان میں ان کا بھی بڑا عمل دخل رہا۔ ۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کا قیام عمل میں آیا تو جو سربرآوردہ علما اس میں پیش پیش رہے اور اس کے لیے مختلف جگہوں کے انہوں نے دورے کیے ان میں یہ بھی تھے اور آخر تک اس سے ان کا گہرا تعلق رہا۔

اسی زمانے میں انہوں نے اپنے بعض رفقاء کے تعاون سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا تاکہ آئے دن کے فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو مایوسی، انتشار پست ہمتی اور احساس کمتری پیدا ہو رہا تھا اسے ختم کر کے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے، ہفت روزہ ندائے ملت کا اجرا اسی احساس کا نتیجہ تھا جس نے بڑی حد تک مسلمانوں کو قوت، جرأت، اور ہمت عطا کی، اب بھی یہ اخبار ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی سرکردگی میں نکل رہا ہے اور مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔

۱۹۶۴ء میں جمشید پور اور راوڑ کیلا وغیرہ کے فسادات نے ملت کے دردمندوں کو گہری تشویش اور سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا، اس کے نتیجہ میں ڈاکٹر سید محمود کی رہنمائی میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی۔ اس کے قیام میں مولانا منظور صاحب کا بھی مکمل تعاون رہا اور اس کے وفود میں شامل ہو کر انہوں نے بھی ملک کے اکثر مقامات کا دورہ کیا جس سے بڑی اچھی فضا بنی مگر بدقسمتی سے یہ اتحاد بہت عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹر سید محمود بہت ملول و متفکر ہوئے، ایک مرتبہ انہوں نے اس صورت حال کا درد و حسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے بعض حضرات کے رویے کی شکایت کی مگر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی سیاسی بصیرت، اصابت رائے اور

معاملہ فہمی کا اعتراف کیا۔

۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل میں بھی وہ شریک رہے اور اسکی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور اپنی تحریروں اور الفرقان کے ذریعہ اس تحریک میں جان و قوت پیدا کی۔

مولانا حالات حاضرہ اور گرد و پیش کے واقعات سے پوری طرح باخبر رہتے، اخباروں کا مطالعہ پابندی سے کرتے، سیاسی اشخاص اور ملی رہنماؤں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی انکے یہاں رہتا، وہ مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے لیے انگریزی اخبار کی اشاعت ضروری سمجھتے تھے اور اس کے لیے اپنی جیسی کوشش بھی کی مگر ابھی تک یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔

مولانا ہندوستان کے دو سب سے بڑے اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن رکین تھے اور بعض نازک موقعوں پر ان کی خداداد ذہانت و صلاحیت اور بر وقت قوت فیصلہ سے ان تعلیم گاہوں کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں بڑی مدد ملی۔ وہ رابطۂ عالم اسلامی کے بھی ممبر تھے اور جب تک ان کی صحت اچھی رہی اسکے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور اسی بہانے حج و عمرہ اور زیارت حرمین کا ثواب بھی لوٹتے رہے۔

دارالمصنفین سے بھی مولانا کا تعلق تھا، مولانا سید سلیمان ندوی سے بعض مسائل میں استفسارات کرتے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سے بھی ان کا مخلصانہ ربط و تعلق تھا، اس کے موجودہ صدر محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تو وہ "رفیق مکرم" ہی تھے، الفرقان نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی پر اپنا خاص نمبر شایع کرنے کا اعلان کیا تو اس خاکسار نے بھی حضرت سے عقیدت کی بنا پر ایک مضمون اس میں اشاعت کے لیے بھیجا جس کی وصولی کی رسید فوراً دیتے ہوئے مولانا نعمانی نے مضمون کی تحسین فرمائی جو میرے لیے مایہ فخر ہے۔

مولانا نے بڑی مصروف و مشغول زندگی گزاری، وہ مدۃ العمر دین و ملت کی خدمت و سربلندی اور مسلمانانِ ہند کی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے، مولانا زہد و تقویٰ حسنِ سیرت اور خوش خلقی سے متصف تھے، طبیعت میں دردمندی اور قلب میں رقت تھی، سریع الحس تھے اس لیے واقعات و حالات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے۔ دینی مسائل میں ان کا ذہن کھلا ہوا تھا، جزئیات میں متوسع تھے، شرعی امور میں تشدد و تصلب کے بجائے سہولت، تخفیف و عافیت پیدا کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔

اس دور کے اکثر اکابر علما و مشائخ سے ان کے تعلقات تھے اور وہ بالالتزام انکے یہاں حاضری دیتے تھے۔ ان کی سبق آموز زندگی کے واقعات و حالات سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور انہیں قلم بند کر کے دوسروں کو بھی ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ اس ضمن میں ان کی یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ جن اکابر کی وہ بڑی عزت اور خاص احترام کرتے تھے، ان کی کمزوریوں اور کمیوں پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی اور کسی نہ کسی پیرایے میں بے جھجک وہ اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے، اس طرح یا تو وہ بزرگ اپنی کمی و کوتاہی کی اصلاح و تلافی فرمالیتے یا اگر خود مولانا کو کسی وجہ سے غلط فہمی ہو گئی ہوتی تو وہ دور ہو جاتی اور ان کی تسلی و تشفی کا سامان ہو جاتا۔

مولانا کی سیرت کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ جس کام کو ٹھیک اور بہتر سمجھتے تھے اس میں تن من دھن سے لگ جاتے لیکن جیسے ہی اس کی غلطی ان پر منکشف ہوتی وہ اس سے فوراً اور بے تکلف کنارہ کش ہو جاتے، اس میں نہ انہیں اپنی سبکی کی پروا ہوتی اور نہ اپنے قدیم رفیقوں اور دوستوں کی خفگی کا خیال ہوتا۔

پچھلے دس برسوں سے وہ علیل تھے، بالآخر وقت موعود آگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر و شکیب عطا کرے۔ آمین

"ض"

مطبوعات جدیدہ

مشاہیر ادب اردو حصہ اول و دوم

مرتبہ جناب عابد رضا بیدار، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات جلد اول ۴۴۵، ۴۴۵ قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

'نام نیک رفتگاں ضائع مکن' کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے خدا بخش لائبریری نے اپنے طباعتی منصوبہ میں اردو زبان کے قدیم اور اہم اور اب نایاب رسائل کے مضامین کے انتخاب کی اشاعت کا پروگرام بنایا، مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفتہ وار رسالہ پیغام کی تو اس نے مکمل فائل شایع کر دی، اس کے علاوہ ہندوستانی، ادیب، العصر، صبح امید، معیار اور زبان جیسے رسائل و جرائد کا انتخاب بھی بڑے سلیقہ سے شایع کر کے بازخوانی کا موقع فراہم کیا، اسی فہرست میں کانپور کے منشی دیانرائن نگم کا مشہور زمانہ رسالہ زمانہ بھی شامل ہے، قریب نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف رہنے والے اس رسالہ کے مضامین و شمولات کو ہندوستانی مذاہب' ہندو مسلم مسئلہ، اسلامیان ہند، تاریخ ہند اور پریم چند وغیرہ موضوعات کے تحت گیارہ جلدوں میں شایع کیا گیا ہے اور اب مشاہیر ادب اردو کے زیر عنوان چار اور جلدیں شایع ہو گئی ہیں جن میں ہمارے پیشِ نظر حصہ اول و دوم ہیں، پہلے حصہ میں منشی محمد حسین آزاد سے جگر و جوش تک اور دوسری جلد میں حالی سے ریاض خیرآبادی تک قریب سو ادیبوں اور شاعروں کا احاطہ کیا گیا ہے، نام سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ

سوانح پر مشتمل تحریریں ہیں مگر در اصل یہ ان مشاہیر کی تحریروں، خطوط، تصاویر اور ان کے متعلق دوسرے اہل قلم کی تحریروں پر مشتمل ہے، مثلاً اکبر الہ آبادی کے ذکر میں ان کی تصویر، خط، کلام اور ان کے متعلق دو مضامین جو رسالہ زمانہ کی زینت بنے ان کو جمع کر دیا گیا ہے، مقصود یہی ہے کہ متعلقہ شاعر یا ادیب کے متعلق رسالہ زمانہ کے حوالہ سے اگر تحقیق مقصود ہو تو اس طرح محقق کے لیے زیادہ آسانی مہیا کی جاسکے، اس کے لیے خدا بخش لائبریری اور جناب عابد رضا بیدار دونوں مستحق تبریک و تحسین ہیں، امید ہے یہ سلسلہ یونہی قایم رہے گا۔

عقیدۂ اسلامی از جناب شاہ محمد عیسیٰ عثمانی فردوسی مرحوم، چھوٹی تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۰۸، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: مکتبہ اہل قلم ۱۵۳/۶۲۲، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

اس مفید و جامع کتاب کے مصنف بہار کے معروف عثمانی خانوادہ کے ولی صفت اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے، دعوت و ارشاد اور اصلاح معاشرہ کے لیے وہ بہ عمر سرگرم رہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں اصلاح عقائد و رسوم کو موضوع بنایا گیا ہے اور بڑے دل نشیں، آسان اور سادہ انداز میں ذات و صفات و افعال الٰہی، ملائکہ، انبیاء، کتب سماویہ، روح و مادہ، عرش و کرسی، لوح و قلم، جبر و اختیار، تقدیر، قیامت، جنت دوزخ کو بیان کیا ہے، شریعت، مقام صحابہؓ، افضلیت تابعینؒ و اولیاء اور شعائر اسلامی کو بھی جمہور اہل سنت کے مسلک کے مطابق اعتدال و توازن سے پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب عام مسلمانوں کے لیے نفع بخش اور مصنف مرحوم کے لیے توشۂ آخرت ثابت ہوگی۔

ع۔ ص۔